ISSN 0974-7346

جون ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ ــــ عدد ۶

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

(Ma'arif Section) 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱	ماہ ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۴ء	عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
Email:
info@shibliacademy.org

شذرات

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جمہوریت کی سب سے بڑی علامت الیکشن یا انتخابات کی شکل میں اس طرح قائم رہی کہ زندگی کے مختلف بلکہ تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہر ہندوستانی کے لیے یہ عمل ایک جشن اور تہوار کی شکل میں بدل گیا، عموماً جشن کے عالم میں حکمرانی محض بے فکری اور جذبات کی پرجوش سرگرمی کی ہوتی ہے لیکن انتخابات کے جشن میں بدل جانے کی روایت نے سنجیدہ فکر، سیاسی شعور، مسائل کا تجزیہ اور مشترکہ قومی مفادات کے تحفظ اور عوام وخواص دونوں کے لیے زندگی بہتر بنانے کی کوششوں کو بتدریج بے معنی اور ناکارہ ہونے میں جس طرح بدلا وہ اب آزادی کے پچہتر سال بعد ایک خوفناک عفریت کی شکل میں سامنے ہے۔

***

ادھر معارف کے کئی شماروں کے قیمتی صفحات مسلسل اسی سیاست کی حکایت یا شکایت کی نذر ہو گئے لیکن یہ کبھی شاید اس لیے دوبارہ دیکھے جانے کے لائق سمجھے جائیں کہ ہندوستان کا آئین، اس کی جمہوریت، اس کے دستوری نظام کی عمارت اور سب سے بڑھ کر متحدہ اور مضبوط ہندوستان کے خواب کی شکستگی اور اس کا بکھراؤ کہاں سے کہاں کیوں پہنچ گیا۔ عوامی ذرائع تعلیم وتربیت کے ڈھانچوں میں دیمک کیوں اور کیسے لگی؟ تاریخ کو ان سوالوں اور ان کے اسباب کا کبھی نہ کبھی تجزیہ کرنا ہی ہے، تجزیہ اس بات کا بھی کہ سیاست اتنی بدرنگ کیسے ہوگئی؟ جمہوری اخلاقیات کی جگہ رذائل ومکروہات سیاست نے کیسے لے لی؟ عہدوں اور منصوبوں اور ذمہ داریوں کی تعظیم، ان کا تقدس، ان کا پاس ولحاظ آخر کیوں پامال کیا گیا؟ رذائل کی سب سے بڑی پہچان جھوٹ آخر قومی شعار کیسے بن گئی؟ اور موجودہ دور میں غلط بیانی اور غلط ترجمانی کے الفاظ حکومتی وجماعتی دروغ گوئی کے لیے اتنے ہلکے کیوں نظر آنے لگے؟

***

۲۴ء کا یہ الیکشن اپنی بدزبانی، الزام تراشی، دروغ گوئی اور سیاسی بے حیائی میں شاید آئندہ اپنی ہی مثال نہ پیش کر سکے، مسائل کی کثرت اور مطمئن زندگی گزارنے کے وسائل کی قلت، الیکشن کا اصل موضوع ان ہی کو ہونا تھا لیکن جیسا کہ بار بار کہا گیا کہ اقتدار وقوت کو جب مکر وفریب کا جامہ پہنایا گیا تو صرف پندرہ بیس فیصد کی اقلیت گفتگو کا محور اس طرح بنادی گئی کہ اس کا مذہب، اس کی تہذیب، اس کی ثقافت، اس کا لباس، اس کی غذا، اس کی شکل وصورت، اس کے آئینی تحفظات، یہ سب، بس اسی ایک اقلیت کے حوالے سے گرمی بازار کے لیے لازم ٹھہرا دیے گئے، اقتدار کا نشہ یقیناً دنیا کے ہر خمار اور ہر نشہ سے طاقتور ہوتا ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ مذہبی آزادی

کے آئین والے ملک میں اذانوں کو چیخنے چلانے سے تعبیر کرنے میں ذرا بھی شرم نہیں آئی، ملک کے سب سے بڑے ذمہ دار نے شاید سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنے ہی میں اپنی کامیابی تصور کر لی ہے، حزب مخالف کے بغیر الکشنی جمہوریت بے معنی کہی جاتی ہے، مگر ایسا کیا ہوا کہ حزب مخالف جو بہر حال اکثریت کے مذہب وتہذیب کی شناخت رکھتی ہے اس کو محض ایک اقلیت کی خوشامد کا الزام دے کر اپنے ہی مذہب وتہذیب سے بے دخل کرنے کی نہایت مذموم کوشش کی گئی، یہ رنگ ایک صوبہ نے پورے ملک میں صرف چند برسوں میں پھیلانے کی کوشش کی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حزب مخالف کے جلسوں کے لیے بہ بانگ دہل ''مجرا'' جیسے لفظ کے استعمال میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کی گئی، ۱۹۴۸ء میں معارف نے لکھا تھا کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صداقت کے نہیں بلکہ قوت کے پرستار ہیں، مگر یہ بہروپیے ہیں جو کبھی بھی اعتبار کے قابل نہیں ہو سکتے، اس وقت معارف کی دور بینی اور دور اندیشی نے آگاہ کیا تھا کہ تنگ خیال تحریکیں ملک کو ویران کر دیں گی، آئین کسی اقلیت کی حفاظت کا سامان نہیں بلکہ اس پر عمل، حفاظت کا سامان ہے۔ اگر اکثریت کا طرز عمل اس کے آئین کے مطابق نہ ہو تو آئین بھی ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ کچھ نہیں۔

***

بات یہی ہے کہ سنجیدہ باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا گیا یا دھیان دینے والے مناسب وقت کے انتظار میں اس طرح رہے کہ وقت ہی نکل گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بے ظرف اور بے شعور اور اقتدار کے ایوانوں میں ادھر سے ادھر پھرنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جو ملک کو کھوکھلا کر دینے والی بے ظرف و بے ضمیر حکمرانی کی تعبیر میں ایسے قصیدے پڑھنے میں نہیں لجاتی جن سے سوداؔ کی ہجو گوئی بھی شرما جائے، کاش دوسروں کو نہیں تو ان اپنوں کے لیے شرم کی کوئی جگہ ہوتی۔

***

اپنی قوم کی بد عملی، اپنے فرائض سے چشم پوشی اور اپنے عقائد واخلاق کی روح سے دوری کا شکوہ کیا جانا چاہیے، یہ فرض ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں ادا کرنے والے سامنے آتے رہے ہیں، مگر ایک نہایت بے ایمان، بے ضمیر، متکبر، مفسد، فتنہ پرداز فکر سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں یہ کہنا کہ مستقبل کے ہندوستان بنانے میں موجودہ قیادت کا کلیدی کردار ہے، اس سے زیادہ تملق اور غیرت کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دانشور کہلانے اور لکھوانے کا شوق برا نہیں لیکن حروف والفاظ کا جال بننے کے ساتھ وہ دل بھی ضروری ہے جس کو دردمند کہا جا سکے۔ دانشوری اصلاً وہی ہے جو چھوٹی چھوٹی وفاداریوں، وابستگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہو، موجودہ دور

کے دجالی فتنوں میں ایسی صحافتی دانشوری بھی شامل ہے،اس سے محفوظ رہنے کی دعائیں ہی کی جاسکتی ہیں۔

***

دارالمصنّفین کے لیے مالی وعلمی فیاضیوں کی مثالیں ،اس کی تاریخ کے روز اول ہی سے تلاش کی جاسکتی ہیں، گذشتہ معارف میں محترمہ حمیدہ بانو کا ذکر آیا، علامہ شبلیؒ ہوتے تو شاید زبیدۂ وقت کی تشبیہ پھر سے حرفِ شکر کو اور دلکش بنا جاتی۔اس کے ساتھ علمی فیاضیوں کا دائرہ بھی وسیع تر ہے جس کی تازہ مثال ملت اسلامیہ ہندیہ کے بزرگ صاحب فکر وقلم مولانا ثناء اللہ عمری کا وہ بڑا قیمتی تحفہ ہے جو فردوسی کے شاہنامہ کی قدیم طباعت میں دوضخیم حصوں کی شکل میں ہے۔مرتضیٰ حسینی برقانی کی خطاطی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، دوسرے حصہ میں بھی دو جلدیں اور ملحقات کے نام سے ضمیمہ بھی ہے،بمبئی کے مطبع ناصری کی طباعت بھی حیران کر دینے والی ہے۔۱۳۱۵ھ میں یعنی قریب سوا سو سال پہلے طبع ہونے والا یہ شاہنامہ اپنی کتابت اور مصوری کی وجہ سے کسی نادر مخطوطہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔اس بیش قیمت تحفہ سے یقیناً دارالمصنّفین کے کتب خانہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے،گرچہ کتب خانہ میں وہ شاہنامہ بھی ہے جو مذکورہ شاہنامہ سے قدیم تر ہے لیکن حسن کتابت وطباعت میں یہ عمری نسخہ کہیں برتر ہے۔ادارہ اس توجہ وعنایت کے لیے مولانا ثناء اللہ عمری کے لیے ثنائیہ شکریہ ادا کرنے میں بجا طور پر فخر محسوس کرتا ہے۔مولانا کی تحریروں کا ایک مسودہ دیدوشنید کے نام سے ہمارے پاس محفوظ ہے اور منتظر ہے کہ کوئی قدردان اس کو زیورِطباعت سے آراستہ کرنے میں معاون ہو۔

***

افسوس دارالسلام عمرآباد کے سرپرست، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور ملک کی مختلف مقتدر تحریکوں ،انجمنوں اور اداروں کے مشیر وممبر جناب کاکا سعید عمری نے بھی اس دنیا کو الوداع کہہ دیا، دارالسلام اور دارالمصنّفین کا تعلق ایک صدی سے زیادہ کے عرصہ پر محیط ہے، کاکا عمر، کاکا سعید اور اب کاکا انیس،اس تاریخ کے اہم ابواب ہیں۔سید صاحبؒ نے کبھی وہاں خطبے دیے تھے، کاکا سعید نے اسی محبت کو قائم رکھا، وہ دارالمصنّفین بھی آئے بلکہ آتے بھی رہے، ماضی کی نسبتوں سے اس کے حال کے احوال پوچھتے رہے۔اہل حدیث عالم تھے مگر ان کے قرب میں تصوف کے رنگ اور عکس دیکھے جاسکتے تھے۔اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے،ان کے حالات کے لیے الگ تحریر کی ضرورت ہے۔

***

مقالات

متن قرآن مجید کا استناد: آثاریاتی شواہد سے تصدیق اور توثیق

عبدالرحیم قدوائی
اعزازی ڈائرکٹر، نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
sulaim_05@yahoo.co.in

مغربی فضلائے اسلام اور مستشرقین نے قرآن مجید کی تنقیص اور تردید کے لیے متعدد حیلے اختیار کیے ہیں۔ چوں کہ وہ وحی الٰہی اور رسالت کے یکسر منکر ہیں، قرآن مجید کے وجود اور اس کے کسی امتیاز کی نفی کے لیے ان کا ایک قدیم، عام اعتراض یہ ہے کہ فی نفسہ قرآن مجید کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اپنے تجارتی اسفار، بحیرہ راہب، ورقہ بن نوفل یا بعض یہودی اور عیسائی راویوں اور زبانی روایات کی مدد سے رسول اکرمؐ نے بائبل کا جس حد تک مطالعہ کیا تھا، اسی کو عربی میں قرآن مجید سے موسوم کر کے آپؐ نے دعوی اپنی رسالت کا کیا اور وحی الٰہی اور بطور ایک نئے مذہب، اسلام کا افسانہ اختراع کیا۔

یہ شر پسند شوشہ ابتداء میں دمشق کے راہب اور رسول اکرمؐ کے معاصر یوحنا John دمشقی (۶۷۵ء-۷۴۹ء) نے چھوڑا۔ اس نے اپنے مراسلوں میں قرآن مجید کو بائبل سے سرقہ اور اسلام کو زندقہ سے تعبیر کیا۔ اسلام سے بغض وعناد اس کو ایسا شدید تھا کہ اپنی تحریروں میں اس نے ''مسلمانوں'' کے بجائے ''آل اسماعیل'' کی اصطلاح استعمال کی۔ یہود اور عیسائیوں کے ہاں ''آل اسماعیل'' کی حقارت جزو ایمان ہے کہ وہ اسماعیلؑ کو پیغمبر ہی تسلیم نہیں کرتے۔

اہم تر نکتہ یہ ہے کہ یوحنا دمشقی وہ پہلا عیسائی عالم ہے جس نے قرآن مجید کے وحی الٰہی یا کلام اللہ ہونے کا صریحاً انکار کیا اور قرآن مجید کے بائبل سے مستعار ہونے کا فتنہ پرور الزام لگایا۔ کلیسا کے ارباب حل وعقد اور مغربی فضلاء نے مزید تحقیق اسی مسموم ذہن کے ساتھ کی اور یہ امر مستشرقین کے مسلمات میں داخل ہے کہ بجنسہ قرآن مجید کی کوئی حیثیت نہیں، کسی ندرت یا امتیاز کا کیا ذکر۔ یہ محض

بائبل کا سرقہ اور چربہ ہے۔عیسائی مناظرے بازوں اور مبلغوں نے اسی تہمت کو شدومد کے ساتھ صدیوں تک فروغ دیا کہ بائبل میں مذکور عقائد،احکام اور بالخصوص انبیاء کے قصے معمولی حذف اور ترمیم کے ساتھ وہی ہیں جن کو قرآن مجید میں نقل کر دیا گیا ہے بلکہ بائبل سے براہ راست واقفیت نہ ہونے کے سبب رسول اللہ نے بائبل کے مندرجات کو خلط ملط کر دیا،نتیجۃً،قرآن مجید بائبل کے ایک قبیح ملغوبے کے بجز اور کچھ نہیں۔ان کے نزدیک رسول اکرمؐ سیاسی اقتدار اور سلطنت کے حریص طالع آزما شخص تھے،اپنی قیادت اور عظمت ان کا واحد مقصد تھا،اسی غرض سے انھوں نے بائبل سے ماخوذ ایک ناقص دین اور بائبل کا ایسا حقیر اور فروتر چربہ،قرآن پیش کیا جو کہ ان کے اپنے مزعومات اور مغالطات سے داغدار ہے۔قرآن مجید کی زبان و بیان غیر معیاری اور ترتیب اور پیش کش غیر منطقی ہے،اس میں کوئی قابل رغبت پہلو نہیں بلکہ اس کے مطالعے سے اس سے اور نفور پیدا ہوتا ہے۔قرآن ان کی دانست میں کسی مطلب اور معنی تک سے عاری ہے،پیغام اور ہدایت کا کیا ذکر۔

آٹھویں صدی سے انیسویں تک کی مغربی تصانیف میں قرآن مجید سے متعلق یہ تاثرات راسخ ہوتے گئے۔اسی ذہنیت کی آئینہ دار کئی اہم بظاہر ''تحقیقی'' کتابیں انیسویں صدی میں منظر عام پر آئیں جو کہ قرآن مجید کے بارے میں استشراقی فکر کی اساس ہیں۔۱۸۳۰ء میں یوروپی جامعات نے قرآن مجید کے مآخذ پر مضمون نویسی مقابلے کا اہتمام کیا۔اس میں اول انعام کا حقدار یہودی مذہبی عالم ابراہام گائیگر Abraham Geiger (۱۸۱۰ء-۱۸۷۴ء) کی تصنیف Mohammed aus dem judenthume aufgenommen? (۱۸۳۳ء) [محمد نے یہودیت سے کیا کیا مستعار لیا؟] کو قرار دیا گیا۔یہ اصلاً جرمن زبان میں ہے اور اس کا لب لباب ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہودی روایات پر انحصار کرتے ہوئے قرآن مجید کو تصنیف کیا[1]۔مسیحی مشن دہلی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ۱۸۹۸ء میں انجمن برائے اشاعت عیسائیت،دہلی نے اسے شائع کیا[2]۔یہ ملحوظ خاطر رہے کہ مغلیہ حکومت کے سقوط اور برطانیہ کے سیاسی تسلط کے بعد عیسائی مبلغین ہندوستان میں فروغ عیسائیت میں اس زمانے میں نہایت سرگرم تھے اور ہندوستان کے مفتوح اور مغلوب مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے درپے تھے۔

۱۔ Abraham Geiger, *Was Hat Mohammad Aus Dem Jude Hume Aufgenommen* Born 1833.

۲۔ Abrahma Geiger, *Judaism and Islam, English translation*: Delhi, 1896

برطانوی مستشرق اور عیسائی عالم دین ٹِسڈال Rev.W.St.Clair Tisdall (۱۸۵۹ء-۱۹۲۸ء) نے ۱۹۰۵ء میں اپنی تحقیق بعنوان The original sources of the Qur'ân (قرآن کے بنیادی ماخذ) شائع کی [۳] جس کی رو سے یہودی اور عیسائی راویوں کی اعانت سے رسول اکرمؐ نے قرآن مجید تیار کیا۔ مسیحی مبلغین نے اس کتاب کو بڑے وسیع پیمانے پر شائع اور تقسیم کیا۔ بائبل کے اردو ترجمے کے ضمیمے کے طور پر اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی اشاعت عیسائیت کا حصہ رہا تاکہ سیاسی قوت، معاشرتی مقام اور معاشی وسائل سے محروم مفلوک الحال ہندوستانی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے انھیں دائرۂ عیسائیت میں شامل کیا جائے۔

یہودیت کے پہلو بہ پہلو عیسائیت کو بھی اسلام اور قرآن مجید کے اصل ماخذ کے طور پر پیش کیا گیا اور اس کو گراں قدر علمی تحقیق گردانا گیا۔ اس فکر کی نمائندہ تصنیف برطانوی مستشرق، انگریزی مترجم قرآن اور عیسائی عالم دین رچرڈ بل Richard Bell (۱۸۷۶ء-۱۹۵۲ء) کی تصنیف The Origin Of Islam In Its Christian Environment (۱۹۲۵ء) [عیسائیت کے ماحول میں اسلام کی بنیاد] ہے [۴]۔ مصنف کے مطابق اسلام/قرآن مجید عیسائیت کا چربہ ہیں۔ اسی ذہنیت کا تتمہ برطانوی مستشرق آرتھر جفری Arthur Jeffrey (۱۸۵۹ء-۱۸۹۲ء) کی کتاب The Foreign Vocabulary Of The Quran (۱۹۳۸ء) ہے [۵] جس میں قرآن مجید میں شامل صرف ۳۱۸ غیر عربی الفاظ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا ذخیرۂ الفاظ بھی اپنا نہیں بلکہ دیگر زبانوں سے مستعار ہے [۶]۔

مستشرقین کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ کوئی مسلم ماخذ قابل اعتبار نہیں لہذا سیرت، حدیث اور روایات کا سارا سرمایہ ناقابل اعتناء ہے۔ وہ صرف کسی غیر مسلم ماخذ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس فکر کے سرخیل منگانا Alphonse Mingana (۱۸۷۸ء-۱۹۳۷ء) [۷]، جوزف شاخت Joseph Schacht

۳۔ William St. Clain Tisdall, *The Original Sources of the Quran*, London 1905.

۴۔ Richard Bell, *The Origin of Islam in its Christian Environment*, London 1925.

۵۔ Aurthur Jeffrey, *The Foreign Vocabulary of the Quran*, Baroda, 1938.

۶۔ قرآن پاک میں ۷۷،۴۳۹ الفاظ ہیں۔

۷۔ Alphonse Mingana, *An ancient Syriac Translation of Kuran Exhibiting New Verses and Variants*, London, 2012.

John Wansbrough اورجان وانزابرا[۸] (۱۹۰۲ء-۱۹۶۹ء) Joseph Schacht (۱۹۲۸ء-۲۰۰۲ء) ہیں۔ان میں مفسد ترین مستشرق جان وانزابراJohn Wansbrough،استاد اسلامیات،لندن یونیورسٹی ہوئے ہیں[۹]۔یہRevisionist School(نظرثانی پسند مکتبۂ فکر) کے بنیادگزار ہیں۔۱۹۸۰ء سے مغرب میں مطالعۂ قرآنیات کے بارے میں یہ ناقابل یقین موقف مقبول ہے کہ اسلام،قرآن مجید،رسول اکرمؐ،صحابہ،مکہ اور مدینہ اور جملہ اسلامی شعائر تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں تراشے ہوئے افسانے ہیں،ان کی فی نفسہ کوئی اصلیت نہیں ہے۔نویں صدی میں جب عباسیوں کو سیاسی اقتدار نصیب ہوا تو کسی بھی نو دولتئے کی مانند انھوں نے اپنا پُرشکوہ ماضی تصنیف کیا اور یہ مفروضات قائم کیے کہ محمدؐ (۵۷۰ء-۶۳۳ء) نامی کوئی شخص تھے جنھوں نے اسلام وقرآن مجید پیش کیے، مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کی اور تبلیغ اور غزوات کے توسط سے اسلام کو ایک نظریاتی، سیاسی اور عسکری قوت بنایا۔یہ کسی بوالعجبی سے کم نہیں کہ اس صریح کذب کی تشریح اور توضیح پر مشتمل مغرب میں ہر سال درجنوں مقالات شائع ہوتے ہیں اوران پر ڈاکٹریٹ کی اسناد عطا ہوتی ہیں اوراسی فکر کے شارح حضرات مغربی جامعات کے شعبۂ اسلامیات کے سربراہ کے طور پر براجمان ہیں۔ان کا اصرار ہے کہ صرف آثاریات،علم کتبہ شناسی ،خطاطی اور علم مسکوکات (سکّہ شناسی) وغیرہ کی معروضی شہادت کی بنیاد پر اسلام کی تاریخ سے متعلق کوئی بیان تسلیم کیا جائے۔

اسی پس منظر میں اس مقالے میں قرآن مجید کے استناد کے بارے میں مستشرقین کے آثاریات پر مبنی موقف کا تجزیہ کیا گیا ہے۔سنہ ۱۹۸۰ءاورسنہ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں یہودی/اسرائیلی ماہر آثاریات نیوو یہودا Yehuda D. Nevo (۱۹۳۲ء-۱۹۹۲ء) نے شام/موجودہ اسرائیل میں واقع صحرائے نقب (Negev) میں J.Koren کے ہمراہ وسیع پیمانے پر خطے کا آثاریاتی مطالعہ کیا[۱۰]۔کھدائی کے ذریعے اس علاقے سے یونانی، رومی، نبطی* اور بازنطینی تہذیب وتمدن کی باقیات برآمد ہوئی ہیں،البتہ

۸۔ Joseph Schacht, *An Introduction to Islamic Law*, London, 1964.

۹۔ John Wansbrough, *Quranic Studies*, Oxford, 1977.

۱۰۔ Yehuda D. Nevo and Judith Koran, *Crossroads to Islam: The Origins of Arab Religion and the Arab State*, Amherst, New York, 2003

* نبطی بھی عرب تھے۔

مقامی عرب ثقافت وتہذیب سے وابستہ کوئی آثار سامنے نہیں آئے، ہر چند کہ مدینہ منورہ النقب سے ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نیووNevo نے یہ اضافہ بھی کیا کہ اپنی آثاریاتی تحقیق میں ان کو مدینہ کے نواح خیبر میں یہودی بستیوں اور قلعوں کا کوئی سراغ بھی نہیں ملا بلکہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے عین غلبۂ اسلام کے زمانے میں اس خطے یعنی شام میں ان کے بقول بکثرت مشرکین کے صنم کدے آباد تھے۔ البتہ حجاز میں مشرکین کے کوئی آثاریاتی باقیات نہیں ملتے۔ ان کا یہ موقف اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے حجاز میں مشرکین اور یہود کی موجودگی کے افسانے تراشے۔

نیووNevo کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ شام/اسرائیل میں واقع النقب میں آثاریاتی تحقیق سے ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلامی تہذیب اور تمدن کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس کے نزدیک مسلم مآخذ اور بیانیہ بے حیثیت ہیں۔ اس تحقیق سے نظر ثانی پسند مستشرقین وانزبراWansbrough، شاخت Schacht، کرونCrone[11]، کُکCook[12] اور ریپینRippin[13] کے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ نویں صدی میں مسلمان منصۂ شہود پر آئے اور انھوں نے ساتویں صدی میں اسلام، قرآن مجید، محمد رسول اللہ، صحابہ، مدینہ کی اسلامی ریاست اور خیبر وغیرہ میں یہودیوں کی آبادی، حدیث اور تمام اسلامی شعائر فرضی طور پر وضع کیے جبکہ ان کا کوئی تاریخی وجود نہیں تھا۔

نیووNevo کا یہ مقدمۂ کبریٰ بنیادی طور پر غلط ہے کہ چونکہ ساتویں/آٹھویں صدی عیسوی کے اسلام کی تصدیق کسی علاقے کی آثاریاتی تحقیق سے نہیں ہوئی، لہٰذا اسے محض افسانہ یا مقدس سازش گمان کرنا چاہیے۔ بائبل میں مذکور تمام تاریخی واقعات ہزاروں سال بعد ضبط تحریر میں آئے اور ان کی تائید اور توثیق کسی آثاریاتی تحقیق سے نہیں ہوتی مثلاً آدم اور حوا، نوح اور ان کی آل اولاد، طوفان نوح،

۱۱۔ Patrica Crone and Michael Cook, *Hagarism: The Making of the Islamic World*, Cambridge, 1977.

۱۲۔ Michael Cook, *Early Muslim Dogma: A Source Critical Study*, Cambridge, 1981.

۱۳۔ Andrew Rippin and Jan Knapper Textual Sources fo rthe Study of Islam, Chicago, 1986.

قدیم مصری، بابلی، سریانی، آشوری، فینیقی، کلدانی اور آرامائی تہذیب اور تمدن اور تاریخ کی بنیاد صرف زبانی روایات ہیں۔ بائبل کے تمام قصے محض بیانات ہیں، ان کی پشت پر آثاریاتی شواہد نہیں ہیں تو کیا اس پورے سرمایۂ تاریخ کو نیووNevo کی منطق کی رو سے مسترد کر دیا جائے؟

نیووNevo کا یہ موقف مفسدانہ اور قطعاً بے بنیاد ہے کہ ساتویں/آٹھویں صدی عیسوی کے النقب سے معاصر اسلامی تاریخ یا مظاہر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ذیل میں ان آثاریاتی شواہد کی تفصیل پیش ہے جس سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی میں اسلام صرف حجاز ہی نہیں بلکہ پورے خطۂ عرب میں پوری طرح غالب اور مستحکم ہو چکا تھا، مصحف قرآن مجید اسی ترتیب سے مدون ہو چکا تھا جو آج تک گزشتہ چودہ سو (۱۴۰۰) سالوں سے رائج ہے اور اسلام کے سیاسی اقتدار کی بالادستی چہار سو ہو چکی تھی۔

آثاریاتی شواہد

(۱)　قبۃ الصخرۃ، (بیت المقدس) پر کندہ آیات قرآنی۔ نیلے اور سنہرے شیشے پر پچّی کاری پر مشتمل اس نوشتے کے دو دائرے ہیں: اندرونی اور بیرونی اور ان دونوں پر قرآنی آیات ثبت ہیں۔ اموی خلیفہ عبدالملک کی ایماء پر کندہ کاری کا یہ عمل ۷۲ھ بمطابق ۶۹۱ء میں انجام پایا۔ ۷۲ھ میں سن تعمیر کے تعین کا سنگ بنیاد آج بھی موجود ہے۔

اس کتبے پر نقش مندرجہ ذیل قرآنی آیات کی یہ معنویت قابل ذکر ہے کہ ان میں باطل اور مشرکانہ عیسائی عقائد کی تردید ہے اور توحید کی تبلیغ اور تشویق ہے۔ ساتویں صدی کا یروشلم صدیوں سے عیسائیت کا مرکز اور منبع تھا۔ اس قرآنی کتبے کی حیثیت محض تاریخی تبرک نہیں بلکہ یہ اشاعت اسلام کا منّا دبھی ہے۔

کتبے کے اندرونی حصے پر کندہ کلمات اور قرآنی آیات:

– اَشْهَدُ أنْ لّا اِلٰهَ اِلّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں''۔

– ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (التغابن:۱)

(تمام چیزیں) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ کی تعریف بیان کرتی ہیں، اسی کی سلطنت ہے اور سب تعریف اسی کی ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

-﴿لَـهُ مُـلْكُ السَّـمَـاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُـحْيِـي وَيُمِيـتُ وَهُوَ عَلَـىٰ كُلِّ شَـيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (الحدید:۲)

(آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

-﴿إِنَّ اللَّـهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (الأحزاب:٥٦)

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجو ۔

- ﴿يَـٰٓأَهْـلَ الْـكِتَـابِ لَا تَـغْـلُـوْا فِـيْ دِيْـنِـكُـمْ وَلَا تَقُولُوْا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُـلِـهٖ وَلَا تَـقُـولُـوا ثَلَاثَةٌ اِنْتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ وَّاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَّكُوْنَ لَهُ وَلَـدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا . لَّن يَّسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَّـكُـوْنَ عَبْـدًا لِّـلّٰـهِ وَلَا الْـمَلَآ ئِـكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَّسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا﴾ (النساء:۱۷۱-۱۷۲)

(اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلومت کرو اور اللہ پر بجز حق کے اور کچھ نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ بن مریم [علیہ السلام] تو صرف اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے کلمہ [کن سے پیدا شدہ] ہیں، جسے [اللہ نے] مریم (علیہا السلام) کی طرف ڈال دیا تھا اور وہ [عیسیٰ] اس کے پاس کی روح ہیں۔ اس لئے تم اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ اللہ تین ہیں۔ اس سے باز آ جاؤ کہ [اسی میں] تمہارے لئے بہتری ہے۔ اللہ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔ مسیح [علیہ السلام] کو اللہ کا بندہ ہونے میں

کوئی ننگ و عار ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ مقرب فرشتوں کو۔اس کی بندگی سے جو بھی دل چرائے اور تکبر وانکار کرے گا، اللہ تعالیٰ ان سب کو اکٹھا اپنی طرف جمع کرے گا)۔

– ﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا. ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ . مَا كَانَ لِلَّهِ أَن يَتَّخِذَ مِن وَلَدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ . وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾(مریم: ۳۳-۳۶)

(اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن اور جس دن میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا، سلام ہی سلام ہے۔یہ ہے [صحیح واقعہ] عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا، یہی ہے وہ حق بات جس کے بارے میں لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا ہونا لائق نہیں۔وہ تو بالکل پاک ذات ہے۔وہ جب کسی کام کے سرانجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے [صرف] کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔میرا اور تم سب کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔تم سب اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے)۔

– ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ . إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾(آل عمران: ۱۸-۱۹)

(اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے۔اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔اور اہل کتاب نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد ہی آپس کی سرکشی اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ جو بھی کفر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا جلد حساب لینے والا ہے)۔

اللہ کی کبریائی کا اعلان، اس کا مطلق اقتدار اور قوت، رسول اکرمؐ کی حقانیت اور آپؐ پر اللہ اور

ملائکہ کا درود اور سلام،عیسیٰ بن مریم کی بشریت،عقیدۂ تثلیث کی تردید،توحید الٰہی کا اثبات،عیسیٰ کا اپنی عبدیت کا اقرار،ابن اللہ کے مشرکانہ تصور کی تغلیط،خدائے واحد کی عبادت پر اصرار،ملائکہ اور اہل دانش وبینش کی توحید کی تائید اور توثیق اور اہل کتاب کا اسلام کے خلاف بغض وعناد،ان آیات کے بنیادی موضوعات ہیں۔

کتبے کے بیرونی حصے پر نقش کلمات اور قرآنی آیات:

–اَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں)۔

–﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ . اَللَّهُ الصَّمَدُ . لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ . وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴾ (الاخلاص:۱-۴)

(آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔نہ اسے کسی نے جنم دیا اور نہ ہی اس نے کسی کو جنم دیا،اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے)۔

–﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَآئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيمًا﴾ (الأحزاب:۵۶)

(اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود بھیجتے ہیں۔اے ایمان والو!تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام (بھی) بھیجو)۔

–﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِى لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا ﴾ (الاسراء:۱۱۱)

(اور یہ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے،نہ ہی اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک رکھتا ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی حمایتی کی ضرورت ہو اور تم اس کی پوری پوری بڑائی بیان کرتے رہو)۔

–﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِى السَّمَاوَاتِ وَمَا فِى الْأَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾(التغابن:۱)

((تمام چیزیں) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ کی تعریف بیان کرتی ہیں۔اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی تعریف ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

– ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (الحدید:۲)

(آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، وہی زندگی دیتا ہے اور موت بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

یہاں بھی اسلامی عقائد کو نمایاں کرنے کے علاوہ رسول اکرمؐ پر اللہ اور ملائکہ کے درود وسلام اور ابن اللہ کے شنیع تصور کا انکار بطور پیغام نوشت ہے۔غرضیکہ ساتویں صدی کا یہ آثاریاتی ثبوت اسلام کے عقائد اور اس کے ہر سو غلبے کی شہادت کا ناقابل تردید مظہر ہے اور نیوو Nevo اور ان کے ہم مسلک مستشرقین کے الزام کی بین تردید۔

یہ حقیقت بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اس کتبے پر نوشت قرآنی آیات اور مصحف عثمانی میں سرمُو کوئی فرق نہیں۔اسی حقیقت کے پیش نظر ایک اور شرپسند مستشرق منگانا Mingana نے یہ شوشہ چھوڑا کہ مصحف قرآن مجید کی تدوین خلیفہ عبدالملک کے دور میں ہوئی۔اس کا مقصود اس بدیہی واقعے کی تکذیب ہے کہ دور عثمانی میں مصحف کی ماسٹر کاپی بن چکی تھی اور وسیع پیمانے پر عالم اسلام میں رائج ہو چکی تھی۔

(۲) دوسرا آثاریاتی ثبوت علم مسکوکات (سکّہ شناسی) سے ملتا ہے۔اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد حکومت میں جاری سکّے (۷۷ھ بمطابق ۶۹۷ء) میں ایک جانب کلمۂ شہادت اور دوسری جانب سورہ الاخلاص ثبت ہے۔ یہ اضافہ غالباً غیر ضروری ہے کہ سورہ الاخلاص میں صرف توحید اور صفات الٰہی کا موضوع ادا ہوا ہے۔اس سورہ میں کسی دوسرے مضمون کا گزر نہیں۔غرضیکہ یہ سورہ عقائد اسلام کی بہترین ترجمان ہے۔بعض سکّوں پر یہ قرآنی آیت ثبت ہے:

– ﴿هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (التوبۃ ۹: ۳۳)

(اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسے دوسرے تمام مذہبوں پر

غالب کر دے اگرچہ مشرک برا مانیں)۔

اس سے بھی مقصود اسلام اور رسول اکرمؐ کے برحق ہونے اور دیگر ادیان بالخصوص مشرکین پر اسلام کے غلبے کا اعلان ہے۔

(۳) مسجد نبوی، مدینہ منورہ میں سمت قبلہ دیوار پر متعدد قرآنی سورتوں کی نقش کاری تھی۔ مسجد نبوی میں توسیع کے باعث یہ دیوار اور اس پر نقش کاری اب محفوظ نہیں ہیں۔ البتہ اس نقاشی کا بالتفصیل تذکرہ ابن رستہ نے اپنے سفرنامۂ حج بعنوان "کتاب الاعلاق النفیسة" (۲۹۰ھ بمطابق ۹۰۳ء) میں کیا ہے [۱۴]۔ یہ نقاشی مغرب میں واقع باب مروان (باب اسلام) سے جنوب مشرق میں باب علی (باب جبرئیل) تک محیط تھی۔ اس کی ابتداء قرآن مجید کی مروجہ ترتیب کے لحاظ سے اولین سورت یعنی سورہ الفاتحہ سے تھی، پھر سورہ الشّمس (سورہ نمبر ۹۱) سے سورہ الناس (سورہ نمبر ۱۱۴) تک کندہ تھیں۔ ان سورتوں کی عبارت ہی پر کیا موقوف، ان ۲۳ سورتوں کی ترتیب بھی من وعن وہی ہے جو مصحف عثمانی میں مذکور ہے اور آج تک رائج ہے۔ یہ مصحف قرآن مجید کے استناد کا آثاریاتی ومعروضی ثبوت ہے۔ ابن رستہ کی مذکورہ بالا روایت کی تصدیق ایک مجہول الاسم اندلسی زائر کی تحریر سے بھی ہوتی ہے جس نے مقامات مقدسہ کی زیارت ۳۰۷ھ تا ۳۱۷ھ بمطابق ۹۲۰ء تا ۹۲۹ء میں کی تھی [۱۵]۔ اپنے رنگوں اور نقاشی کے انداز سے یہ پچّی کاری قبۃ الصخرہ کی نقاشی سے مشابہ ہے۔ مسجد نبوی کی دیوار پر ان قرآنی سورتوں کی نقاشی اموی خلیفہ الولید کی ہدایت پر والیٔ مدینہ عمر ابن عبدالعزیز کی نگرانی میں ۸۸ھ تا ۹۱ھ بمطابق ۷۰۶ء تا ۷۱۰ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس دور میں بھی مصحف قرآن مجید کی موجودہ ترتیب معروف تھی۔

(۴) محمد بن عمر الواقدی (م: ۲۰۷ھ بمطابق ۸۲۳ء) کی روایت کے بموجب مسجد نبوی مدینہ منورہ کے دروازوں کے دونوں جانب (اندر اور باہر) قرآنی آیات کندہ تھیں [۱۶]۔ مصحف سے مسلمانوں کا یہ فرط تعلق اور اجتماعی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں اس کے مظاہر مستشرقین بالخصوص

۱۴۔ Ibn Rustan, *Kitab Al-Alaq Al-Nafisah.* Ed. M.J. De Goeje, Leiden, 1982, p 70.

۱۵۔ *Al-Iqd Al-Farid*, Ed. A. Amin et al. Cairo, 1368H / 1949 CE, 6,261.

۱۶۔ Al-Samhudi, *Wafa Al Wafa bi Akhbar Dar Al Mustafa*, Ed. M.M. Abd Al-Hameed., Cairo, 1374 H / 1955 CE, 1/1371.

وانز برا Wansbrough کے اس دعوی کو منہدم کرتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک قرآن مجید کا وجود نہیں تھا۔

(۵) وحی الٰہی کی ابتداء ہی سے رسول اکرمؐ نے نازل شدہ قرآنی آیات کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے تحریری طور پر املا کرانے کا اہتمام کیا۔ احادیث میں متعدد کاتبین قرآن مجید کی تفصیلات درج ہیں۔ مصحف عثمانی کی تکمیل کے بعد ناقلین مصحف کثرت سے منظر عام پر آئے۔ اسی کا اطلاق مصحف کے نقاشوں اور کندہ کاروں پر بھی ہوتا ہے۔ ابن الندیم (م: ۳۸۰ھ-۹۹۰ء) کی اطلاع کے مطابق مسجد نبوی کی دیوار پر قرآنی سورتوں کو خالد بن ابی الهیاج، مولیٰ علی بن ابی طالب نے کندہ کیا تھا۔ خالد ہی نے خلیفہ الولید اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ذاتی استعمال کے لیے مصحف بھی نقل کیے تھے۔ قرآن مجید کے ایک اور ممتاز نقاش سعد مولیٰ حویطب ابن عبدالعزی ہوئے ہیں۔ آپ قریشی صحابی تھے اور آپ کی وفات سنہ ۵۴ھ بمطابق ۶۷۴ء میں ہوئی۔ نقل مصحف سے ان کے انہاک کے پیش نظر ان کا لقب ہی ''صاحب المصاحف'' (مصحف والے) پڑ گیا تھا۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدینہ کا ایک محلّہ ''اصحاب المصاحف'' سے موسوم تھا کیوں کہ اس کے زیادہ تر ساکن نقل مصاحف میں مصروف رہتے تھے۔ ایک اور نمایاں کاتب مصحف ابوحازم عبدالرحمٰن بن ہرمز بن کیسان العرج (م: ۱۱۷ھ/۷۳۵ء) ہیں۔ مالک بن انس راوی ہیں کہ عمرو بن رافع اور ابو یونس نے امہات المومنین حفصہ بنت عمر بن الخطاب (م: ۴۵ھ/۶۶۵ء) اور عائشہ بنت ابی بکر الصدیق (م: ۵۸ھ/۶۷۸ء) کے لیے مصحف نقل کیے تھے۔ ناقلین مصحف سے متعلق متعدد روایتیں پہلی صدی ہجری کی ہیں اور ان سے یہ متبادر ہے کہ مصحف عثمانی کی نقل اور نشر و اشاعت کا اہتمام پہلی صدی ہجری میں عام تھا۔ اوائل اسلام میں قرآن مجید کے کلیدی مقام کے شاہد یہ کتبے ہیں جو کہ ناقابل تردید آثاریاتی ثبوت کے حامل ہیں:

- غزوۂ احزاب کے دوران جبل سلع، مدینہ پر کتبہ جو کہ ۵ھ/۶۲۶ء کا ہے [۱۷]۔

۱۷۔ M. Hamidullah, *Six Originaux Des Lettres Diplomatiques Du Prophete L'Islam*, Paris 1986, pp.62-65

-توپ کاپی سرائے، استنبول، ترکی کے عجائب خانے میں محفوظ رسول اکرمؐ کا والیٔ الاحصاء، المنذر بن ساوہ کے نام مکتوب جو کہ ۸ھ/۶۲۹ء کا ہے۔ اس مکتوب پر رسول اکرمؐ کی مہر نمایاں ہے [۱۸]۔

-بازنطینی شہنشاہ ہرقل کے نام رسول اکرمؐ کا مکتوب جو کہ ۸ھ/۶۲۹ء کا ہے [۱۹]۔

-اسوان، جنوبی مصر میں کوفی رسم الخط میں کتبہ جو کہ ۳۱ھ/۶۵۲ء کا ہے۔

-جنوبی مصر میں ۳۱ھ/۶۵۲ء کی ایک قبر پر نصب کتبہ جس کا آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہے [۲۰]۔

-کوفی رسم الخط میں طائف میں نصب ۴۰ھ/۶۶۰ء کا کتبہ جس کی عبارت یہ ہے: ''عبدالرحمٰن بن خالد بن العاص پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو'' [۲۱]۔

-طائف کے نزدیک بند معاویہ پر ۵۸ھ/۶۷۷ء کا کتبہ [۲۲]۔

-مکہ کے نزد آیت قرآنی پر مشتمل ۸۰ھ/۶۹۸ء کا کوفی رسم الخط میں کتبہ [۲۳]۔

-مکہ کے نزد کوفی رسم الخط میں تحریر کتبہ جس پر آیات البقرہ۲:۲۱ اور النساء۴:۱ ثبت ہیں یہ کتبہ ۸۴ھ/۷۰۲ء کا ہے [۲۴]۔

یہ تمام آثاریاتی شواہد آج بھی محفوظ ہیں اور نیوو Nevo کے اس گمراہ کن مفروضے کی نفی کرتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی سے قبل اسلام کا کوئی آثاریاتی سراغ نہیں ملتا ہے۔ یہ آثاریاتی شواہد اسلامی تاریخ، سیرۃ، صحابہ اور مصحف قرآن مجید کے استناد کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

۱۸۔ Ibid, p. 111

۱۹۔ Ibid, p. 149

۲۰۔ A. Abdur Razzaq Ahmad, *In Masahif Sana,* p. 32 (Arabic Section)

۲۱۔ A. H. Sharafadiin, "Some Islamic Inscriptions Discovered on the Darb Zubayda", Al-Atal, vol.1, 1397 H/1977 CE, pp.69-70.

۲۲۔ G. C. Miles, "Early Islamic Inscriptions Near Taif in the Hidjaz", JNES, 7 (1948), pp 236-242.

۲۳۔ Ar-Rashid, Kitabat Islamiyya min Makkat al-Mukarrama, Riyadh, 1416H/1995 CE, pp. 160-161

۲۴۔ Ibid, pp. 26-29

ان موصوف نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بعنوان *The Quran:Translated With a Critical Rearrangement of Surahs* (۱۹۳۷ء-۱۹۳۹ء) کیا ہے۔ترجمے میں درآئی سیکڑوں اغلاط کے علاوہ انہوں نے یہ ظلم بھی کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کردی ہے۔سونے پر سہاگہ،کم وبیش ہرآیت کے بارے میں یہ اظہارخیال بھی کیا ہے کہ اصل قرآن مجید کا جزو ہی نہیں بلکہ کاتبین کی غلطی سے متن میں شامل ہوگئی ہے یا اس کا اضافہ بعد میں کیا گیا یا یہ غلط مقام پر درج ہے۔متن قرآن مجید پر ان کی اس سفاکانہ جراحی کے بارے میں ایک نسبۃً منصف مزاج مستشرق الفرڈ گیلوم Alfred Guillaume کا یہ تبصرہ چشم کشا ہے:''مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ بل Bell کی قطع وبرید اس وسیع پیمانے پر ہے کہ میں ان کا ترجمۂ قرآن استعمال ہی نہیں کرسکتا۔محض اپنی ذاتی رائے کی بناء پر آیات کو حذف کردینا یا ان کا مقام تبدیل کردینا اور جملوں اور فقروں کو ساقط کردینا ایسی متنی تنقید کے خلاف ردعمل پیدا کرتا ہے۔بل Bell کے ہاں احساس تناسب مطلق مفقود ہے'': Alfred Guillaume, "Review", *Muslim World,* 47:1 (1957), p. 248.

حوالے:

اس مقالے کے لوازمے کے لیے ان تین اہم مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

1) Estelle Whelan, " Forgotten Evidence for the early codification of the Quran", *Journal of the American Oriental Society,* Jan - Mrach 1998, 118:1, pp. 1-14.

اس مغربی فاضلہ کا یہ منصفانہ مقالہ بالخصوص قابل قدر ہے۔

2) Muhammad Mohar Ali, *The Quran and the Orientalists*. Norwich, U.K., Jamiat Ihya Minhaj Al- Sunnah, 2004.

3) M.M. Al - Azami, *The History of the Quranic Text: From Revelation to Compilation.* Leicester, U.K., Islamic Academy, 2003.

☆☆☆

دینی مدارس کے لئے ''لسان قوم'' کی اہمیت

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

profmohsinusmani@gmail.com

مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی ضروری ہے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو سمجھیں۔ اگر ہم اپنی غلطیوں کو نہیں جانیں گے تو صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکیں گے۔ غلطی کو چند لفظوں میں بیان کریں تو ہم کہیں گے کہ اسلام جو ایک دعوتی مشن تھا اس کی گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ یہاں کوئی شخص پوچھ سکتا ہے کہ گذشتہ صدیوں میں جو اسلامی خدمات انجام دی گئیں، وہ آخر کیا تھیں؟ کیا ان کا تعلق دعوتی مشن سے نہیں تھا؟ ذیل کی چند سطروں میں علمائے دین کی ان خدمات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ہماری تاریخ کا جلی عنوان ہیں۔

بلاشبہ ہندوستان مسلمانوں کی دعوتی، تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کا مرکز رہا ہے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں کاروان اہل دل نے اسلام کی اشاعت کا کام کیا اور ہزاروں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلم سلاطین کی سرپرستی میں یہ ملک مسلمانوں کے لئے گلشن بے خار بن گیا[1]۔

ہندوستان میں مشائخ روحانی اور علمائے ربانی کے ذریعے اور ان سے پہلے مسلمان تاجروں کے ذریعے یہ کام انجام پایا۔

ایک عرصے کے بعد علمائے دین نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب اور تہذیبوں کے خیالات و عادات بھی مسلمانوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس لئے دعوتی اور تبلیغی کام کا رخ حفاظت دین، تطہیر عقائد، ردّ بدعات اور اصلاح رسوم کی طرف مڑ گیا۔ یعنی اب دفاعی نوعیت کے کام کی طرف

ا۔ یہ داستانِ فصل گل راقم سطور نے اپنی کتاب ''دعوت اسلام، اقوام عالم اور برادرانِ وطن کے درمیان'' میں بیان کی ہے۔

مسلمان علماء متوجہ ہو گئے، دعوتی کام یا اقدامی نوعیت کا کام پس پشت چلا گیا۔ اُس وقت سے لے کر اب

تک بہ حیثیت مجموعی مسلم علماء اور قائدین کے کام کا رخ یہی رہا ہے، یعنی اشاعت دین کے بجائے صرف حفاظت دین۔ بعد میں سیاسی تحریکیں بھی مسلمانوں میں اٹھیں لیکن برادران وطن کے درمیان دعوتی فکر کا زمانہ واپس ہی نہیں آیا۔ صورت بایں جا رسید کہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت اور ان کی عبادت اور شرک کے طوفان کو دیکھ کر بھی اہل دین میں وہ بے چینی پیدا نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے، جو پیغمبروں کو ہوتی تھی، جس کا ذکر بار بار قرآن میں پیغمبروں کے تذکرے میں آیا ہے اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ کیا آپ ان (مشرکوں) کے ایمان نہ لانے سے خود کو ہلاک کر ڈالیں گے (الشعراء: ۳)۔ انسان اگر بت پرستی اور شرک کے خلاف فوراً عملی دعوتی اقدام نہ کر سکے تو یہ بات قابل معافی ہے لیکن شرک کی گرم بازاری کو دیکھ کر دل کی بے چینی کا نہ ہونا اور صرف مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام پر مطمئن ہو جانا اور اس کو دعوت سمجھ لینا ایمان کے کمزور ہو جانے کی علامت ہے۔ دل کی بے چینی اگر ہو گی تو انسان سوچے گا اور کام کا منصوبہ بنائے گا لیکن شرک کے طوفان اور کفر کے سیلاب کو دیکھ کر کوئی پریشانی دل کو نہ ہو تو یہ ایمان کی صحت مندی کی علامت نہیں اور یہ انبیائی مزاج نہیں ہے۔

اسلام کی دعوت کا مشن زمانہ ہوا پٹری سے اتر گیا۔ گاڑی ڈی ریلیمنٹ کا شکار ہو گئی۔ مسلمانوں کی ساری جدوجہد مسلمانوں کی اصلاح پر مرکوز ہو گئی۔ پیغمبرانہ مشن جو سب سے پہلے بت پرستی کے خلاف کھڑا ہوتا ہے اور چار دانگ عالم میں توحید کا آوازہ بلند کرتا ہے، جو معبودان باطل پر کاری ضرب لگاتا ہے، وہ میدان سے کنارہ کش ہو کر اقبال کی شاعری میں محبوس اور محصور ہو گیا:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

گاڑی کو پٹری سے اترے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ توحید کا انبیائی مشن مسلمانوں کی اصلاح و تربیت و تزکیہ نفس تک محدود ہو گیا۔ صورت حال اب یہ ہو گئی ہے کہ اگر کسی کو اس کی جانب توجہ دلائی جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے اب اس کے لئے حالات ساز گار نہیں ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں ہے کہ کلیم صدیقی اور عمر گوتم کو گرفتار کیا جا چکا ہے؟ میں نے کہا: جب حالات ساز گار تھے اور کئی سو سال تک مسلمانوں کی حکومت تھی تب تو انبیائی مشن پر عمل نہیں ہو سکا۔ اب تو ناساز گار حالات میں ہی انبیائی مشن کو شروع کرنا ہوگا اور حضرت ابراہیم کی طرح آگ میں کودنے کے لئے بھی تیار ہونا پڑے گا اور اس کے بغیر ہر گز حالات نہیں بدلیں گے۔ مسلمانوں کا جرم یہ ہے کہ خیر امت کی خلعت فاخرہ انہیں مرحمت کی گئی تھی

(کُنتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ - آل عمران: ۱۱۰) لیکن انہوں نے اپنے کو اس کا اہل ثابت نہیں کیا اور ''اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ'' پر عمل نہیں کیا بلکہ صرف مسلمانوں کے درمیان اپنی کوششوں کو محدود کرلیا۔ لسان قوم میں ''ناس''، یعنی بنی نوع انسان تک دین کی دعوت پہونچانے کے بجائے صرف مسلمانوں تک خود کو محدود کرلیا اور صرف لسان مسلمین میں مسلمانوں کے درمیان تقریر کر لینے کو دعوت سمجھ بیٹھے صرف مسلمانوں میں خطاب کرنے کو انہوں نے دعوت کا کام سمجھ لیا۔

یہ تاریخی غلطی سیکڑوں سال سے چلی آرہی ہے۔ قرآن میں ہے و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (سورۂ ابراہیم: ۴) یعنی ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں کار رسالت ادا کرنے کے لئے بھیجا لیکن چونکہ گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی، ہم نے لسان قوم کے ذریعے کار رسالت انجام دینے کے لئے ایک بھی تعلیمی ادارہ اپنی پوری تاریخ میں قائم نہیں کیا۔ جامعہ القرویین مراکش میں ۸۵۹ء میں قائم ہوئی۔ یہ مسلمانوں کا قدیم ترین تعلیمی ادارہ ہے۔ جامعۃ الازہر دوسری قدیم ترین یونیورسٹی ہے جو قاہرہ میں ۹۷۰ء میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند مشہور دینی تعلیمی ادارہ ہے جسے مولانا قاسم نانوتوی نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا۔ مدرسہ مظاہرالعلوم کی بنیاد بھی ۱۸۶۶ء میں ڈالی گئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ۱۸۹۳ء میں پڑی۔ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر ۱۹۰۹ء میں قائم ہوا۔ ان مدرسوں کے نصاب اور نظام کے مطابق اور ان کے نہج پر بہت سے اور مدرسے قائم ہوئے جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ جے پور میں جامعہ الہدایہ کا قیام عمل میں آیا جدید علوم اور دینی علوم کا امتزاج جس کی خاص شناخت تھی۔ ان کے علاوہ بے شمار ادارے ہیں جن سے مفسرین اور محدثین، فقہاء اور سیرت نگار اور بڑے علماء اور مفتیان کرام پیدا ہوئے لیکن پیغمبرانہ مشن کو لے کر کھڑا ہونے والا اور مشرکین کے درمیان انذار وتبشیر کا کام کرنے والا کوئی ایک عالم، کوئی ایک مصلح، کوئی ایک مجدد پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں کوئی بھی مشرکین کی زبان سے اور لسان قوم سے واقف نہ تھا۔ مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی قائم کی اور اس طرز کے کچھ اور ادارے بھی۔ ان اداروں میں ضرور لسان قوم انگریزی زبان پر توجہ کی گئی لیکن مقصد دوسرا تھا۔ سرکاری ملازمت اور بہتر معاشیات غرض وغایت تھی، پیغمبرانہ مشن پر کھڑا ہونا سرے سے مقصد ہی نہیں تھا۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے شعر میں اور مخصوص رنگ میں یہ بات اس طرح کہی ہے:

ہے دل روشن مثال دیو بند اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
اور علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو اک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز گو کہ فکر آخرت ہے اصل چیز

ایک بار پیغمبرانہ مشن کی گاڑی جو تاریخ میں پٹری سے اتری تو پھر دوبارہ پٹری پر نہیں آسکی دینی تعلیم کے سیکڑوں ادارے اس ملک میں اور ملک کے باہر قائم ہوئے لیکن کسی ایک مدرسہ میں بھی لسان قوم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تا کہ پیغمبرانہ مشن کو از سر نو زندہ کیا جا سکے۔ جہاں جہاں دینی تعلیم کے ادارے تھے وہاں کے فضلا لسان قوم سے نا آشنا تھے، اس لئے قوم کے درمیان یعنی برادران وطن کے درمیان انذار وتبشیر کا پیغمبرانہ کام وہ کر ہی نہیں سکتے تھے اور جو جدید تعلیم کے ادارے مسلمانوں نے قائم کئے تھے وہاں لسان قوم کی تعلیم تو دی جاتی تھی لیکن پیغمبرانہ مشن وہاں سرے سے مقصد ہی نہ تھا۔ ایک کے پاس وہ سفینہ نہ تھا جو ساحل مراد تک پہونچا تا، دوسرے کے پاس سفینہ تھا لیکن ساحل کی تمنا مفقود تھی، بقول شاعر:

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے اسے کشتی نہیں ملتی اُسے ساحل نہیں ملتا

لسان قوم سے لاعلمی کا مسئلہ آشوب قیامت سے کم نہ تھا جس نے پیغمبرانہ مشن سے امت کو بہت دور کر دیا اور شرک اور بت پرستی کے سبزے کو اور بھی سرسبز ہونے دیا۔ اس نے امت کے دل سے احساس زیاں تک کو ختم کر دیا اور کئی ایک عالم دین کے دل میں اس نے یہ اطمینان پیدا کر دیا کہ اس نے قرآن کی تفسیر اردو یا عربی میں لکھ دی ہے اور حدیث کی شرح اتنی جلدوں میں کی ہے کہ اس بار کا اٹھانا مشکل ہے۔ اس کے دل میں بھی یہ قلق اور اضطراب پیدا نہیں ہوا کہ اس نے دو چار مشرکین اور کفار تک ان کی زبان میں دین اسلام کو پہونچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے پیغمبر کے غم کو بھی ایک دن کے لئے بھی اپنا غم نہیں بنایا جس کا ذکر قرآن میں لعلك باخع نفسك ان لا يكونوا مومنين (الشعرا:۳) کیا اس سے یہ حقیقت آشکارا نہیں ہو جاتی ہے کہ گاڑی ایک بار جو پٹری سے اتری ہے وہ دوبارہ پٹری پر نہیں آسکی ہے۔ شاکلہ ذہنی اتنا بدل چکا ہے کہ جس مدرسہ میں جایئے افتاء کی ٹریننگ کا کورس موجود ہے جس میں انبوہ در انبوہ طلبہ داخلہ لے رہے ہیں لیکن کہیں لسان قوم میں اور انگریزی زبان میں دین کی دعوت کے لئے کوئی شعبہ قائم نہیں ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لسان قوم کی تعلیم لازمی ہوتی اور سینکڑوں عنوانات پر انگریزی اور لسان قوم میں تقریر وتحریر کی مشق کرائی جاتی اور اس میں کامیاب ہوئے بغیر مدرسہ

کی سند نہیں دی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔شعور ہی نہیں تھا۔قرآن پڑھنے، حدیث پڑھنے اور دورہ حدیث میں شریک ہونے کے باوجود پیغمبرانہ مشن کی ضرورت کا احساس نہیں تھا، اس لئے نہ تو پیغمبرانہ مشن شروع ہوسکا نہ اپنی کسی غلطی کا احساس ہوسکا۔ جب سلف نے یہ دعوتی کام نہیں کیا تھا تو بعد کے علماء کیسے کرتے؟ سلف کے کاموں سے متعلق تو تاویل حسنِ ظن ممکن ہے۔قرن اول کے بعد کی جو صدیاں ہیں ان میں دعوت اور جہاد کے نتیجے میں تمام مسلم ملکوں میں ۸۰ اور ۹۰ فی صدی مسلمانوں کی آبادی ہوگئی تھی، تھوڑے سے غیر مسلم ذمی کی حیثیت سے رہتے تھے۔اس لئے علماء کی ساری توجہ اصل پیغمبرانہ مشن کے بجائے حدیث وفقہ اور اسلامی علوم کی تدوین اور علوم کے ترجموں کے کاموں کی طرف رہی۔اس وقت یہی کام مناسب تھا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب کبھی کہیں کسی ملک میں مکی زندگی واپس آجائے، مسلمان اقلیت میں ہوں اور دوسری قوموں کے درمیان گھرے ہوئے ہوں تو وہاں مقدم وہی کام ہونا چاہیے جو مکی زندگی میں ہوا تھا یعنی لسان قوم میں قوم کو دعوت دینے کا کام۔مسلمانوں کی غلطی یہ تھی کہ یہ کام انہوں نے نہ ہندوستان میں کیا اور نہ اسپین میں کیا۔ دونوں جگہ وہ وہی علمی کام کرتے رہے جو بنوعباس کی حکومت کے زمانے میں کیا کرتے تھے یعنی خالص علمی نوعیت کے کام، یعنی وہ شاکلہ ذہنی جو مسلمانوں کے اقتدار کے زمانے میں مسلمانوں کا بن گیا تھا، حالات کے لحاظ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔اس میں ابتدائی دور کے مشائخ صوفیہ کا استثناء ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ہندوستان اب اسپین کے راستے پر ہے۔اور اس کی اصل وجہ پیغمبرانہ مشن سے دست بردار ہوجانا ہے۔

بیسویں صدی نے ہندوستان میں کئی عبقری شخصیتیں پیدا کیں۔ مولانا مودودی (۱۹۰۳ - ۱۹۷۹ء) نے اسلام کی ایک عظیم نظریاتی تحریک برپا کی جس کے اثرات پورے عالم اسلام پر پڑے۔ اس تحریک نے اقامت دین کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ دعوت اس جماعت کا مقصد اولین تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مولانا مودودی کا یہ بہت صائب مشورہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں کی انگریز دشمنی تو ختم ہوجائے گی لیکن مسلم دشمنی باقی رہے گی۔ یہاں کی تیرہ وتار فضا میں جو سب سے اہم کام کرنے کا ہوگا وہ یہ کہ اسلام کے پورے لٹریچر کو ہندی اور مقامی زبانوں میں منتقل کردیا جائے اور یہ لٹریچر غیر مسلموں تک پہونچایا جائے۔ بالفاظ دیگر لسان قوم کے ذریعہ ہندوستانی قوم میں اشاعت دین کا کام کیا جائے۔انھوں نے اپنے خطبہ مدراس میں

مسلمانوں کو کتنا صحیح مشورہ دیا تھا:

چوتھا سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر وتقریر کی قابلیت بہم پہونچائیں جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کر دیا جائے۔ جنوبی ہند میں ٹیمل، تلنگی، کنڑی، ملیالم اور مرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور ان ہی میں ملک کا لٹریچر بھی شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر وتقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بیگانے ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔ بلاشبہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے کیونکہ اب تک کا ہمارا سارا سرمایہ علم وتہذیب اس زبان میں ہے لیکن ہم اسلام سے مستقبل کو اردو زبان کے دامن سے باندھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اور ان سب زبانوں کو اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے لئے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا صرف غیر مسلموں ہی کے خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درسگاہوں سے باہر ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے (روداد پنجم ۱۸۳-۱۸۴)۔

یہ مولانا مودودی کی فراست مومنانہ تھی کہ انہوں ہندوستان میں لسان قوم کی اہمیت کو محسوس کیا اور بتا دیا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا ہے اور اگر یہ سب نہ کیا گیا تو کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں بیسویں صدی کی دوسری اہم شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کی تھی۔ عرب وعجم ہر جگہ اللہ نے ان کو غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔ انہوں نے انبیاء کرام کے حالات پر کئی کتابیں لکھی تھیں (النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن ، قصص النبیین وغیرہ)۔ اسی کے ساتھ

انھوں نے تاریخ اسلام کے تمام مصلحین اور مجددین کا تذکرہ بھی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے نام سے کئی جلدوں میں لکھا ہے۔

ہم نے اوپر کی سطروں میں پیغمبرانہ مشن اور ہمارے مصلحین کے کام کے درمیان جو بنیادی فرق تھا وہ بیان کیا ہے، اس فرق کا جاننے والا مولانا ابوالحسن علی سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ لیکن اس فرق کو انھوں نے بھی اس طرح بیان نہیں کیا جس طرح میں نے بیان کیا ہے۔ مولانا نے ہمیشہ احتیاط برتی اور اپنی شخصیت کو اختلافی شخصیت نہیں بننے دیا۔ انہوں نے اپنی متفقہ قائدانہ شخصیت کی ہمیشہ حفاظت کی۔ انھوں نے پیغمبرانہ مشن اور تاریخ کے دعوت وعزیمت کے عظیم کرداروں کے درمیان جو فرق رہا ہے اس کو ضرور محسوس کیا ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ ہر پیغمبر اپنی قوم سے لسان قوم میں خطاب کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم سے اور قوم کے اصاغر واکابر سے، اعیان ومشائخ سے پورے طریقہ سے واقف ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر دعوت کا پلیٹ فارم اس کو تیار ملتا ہے۔ وہ دعوت کے کام کو اللہ کے حکم سے شروع کردیتا ہے (فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين - الحجر: ۹۴)۔

مولانا ابوالحسن علی نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں دعوت کا پلیٹ فارم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس لیے پہلے مرحلے میں ضروری کام یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں کو اسلام اور مسلمانوں سے مانوس کیا جائے۔ مولانا علی میاں نے یہ بات واضح طور پر کبھی نہیں کہی اور اگر وہ یہ کہتے تو شاید یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی کہ وہ سب سے یہ کہتے کہ پیام انسانیت کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کہ باشندوں کو بعد میں اسلام کی دعوت دی جاسکے۔ لیکن میری بات بھی ظن وتخمین پر مبنی نہیں ہے۔ میرے پاس میری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ندوہ میں مولانا علی میاں ہر سال فارغ ہونے والے طلبہ سے خطاب کرتے تھے اور ان کو جو نصیحتیں کرتے تھے ان میں ایک نصیحت یہ بھی ہوتی تھی کہ آپ جہاں بھی رہیں برادران وطن کو، اسلام سے مانوس کرنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک مولانا کی پیام انسانیت کی تحریک کی نظریاتی اساس یہی ہے یعنی برادران وطن کو اسلام سے اور مسلمانوں سے مانوس کرنا اور اسلام کی اخلاقی برتری قائم کرنا۔ انھوں نے مولانا عبدالکریم پاریکھ اور کچھ دوسرے اشخاص کو ساتھ لے کر مختلف شہروں میں جلسے شروع کئے، اور جلسے سے کچھ دن پہلے کچھ لوگ شہر میں پہونچ کر شہر کے غیر مسلم اعیان واشخاص سے مل کر ان کو جلسے میں آنے کی دعوت دیتے تھے۔ پیام انسانیت کی تحریک کا مقصد دعوت

اسلام کے لئے ماحول تیار کرنا تھا،فضا کو ساز گار بنانا تھا،لیکن ان کی پوری تحریک کو بہت کم لوگ سمجھ سکے۔اور سمجھے تو بس یہ سمجھے کہ یہ میل ملاپ کی تحریک ہے۔اور پھر بعض دینی شخصیتوں کے ہونٹوں پر خندہ استہزاء بھی ہوتا تھا۔جس ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلافات اور بدگمانیوں کی خلیج حائل ہو وہاں دعوت کے لیے کوئی شخص کوئی حکمت عملی اختیار کرے تو اس کی قدر کرنی چاہیے کہ دعوت کا یہ کام باہمی اعتماد کی فضا قائم کیے بغیر ممکن نہیں اور اسی مشکل کی وجہ سے اور کچھ شاکلۂ ذہنی کی تبدیلی کی وجہ سے پچھلی کئی صدیوں سے پیغمبرانہ مشن بے اعتنائی کا شکار رہا۔مولانا علی میاں کی پیام انسانیت کی تحریک اگر چہ موجود ہے لیکن اب یہ وہ دریا ہے جو متلاطم نہیں ہے۔حالات کی سنگینی سے تمام دینی کام متاثر ہوئے ہیں۔یہ خزاں کا موسم ہے،چمن میں باد سموم چل رہی ہے۔لیکن اللہ کی مدد موسم کی ناسازگاری کے باجود دینی اور دعوتی کام کے جاری رکھنے ہی سے آتی ہے:ان تنصروا الله ينصركم و يثبت اقدامكم (سورہ محمد:۷)

مولانا علی میاں ندویؒ میری دانست میں پہلے ہندوستانی عالم دین ہیں جنہوں نے علم کی دینی و دنیوی اور قدیم وجدید کی تفریق کی مخالفت کی اور علم کو ایک اکائی قرار دیا(بحوالہ:مولانا کی تقریر،کتاب دعوت فکر وعمل)۔اگر نیکی اور شرافت کو قدیم اور جدید خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا ہے اور عقل کی نئی اور پرانی تقسیم غلط ہے اور اگر عدل وانصاف کو نیا یا پرانا نہیں کہا جا سکتا ہے اور جس طرح سورج بھی نہ نیا ہے نہ پرانا،اسی طرح علم بھی ایک اکائی ہے اور نا قابل تقسیم وحدت ہے۔اسی طرح مولانا علی میاں مدارس کے حلقے میں وہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے طالبان علوم نبوت کو ان کا مقام یاد دلایا اور کہا کہ مدرسہ کا طالب علم دین کے چشمے سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالتا ہے۔کشت زاروں میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے قرآن وحدیث کی زبان میں جو حق اور صداقت موجود ہے اسے وہ لیتا ہے اور پھر لسان قوم کے ذریعے قوم کے افراد تک پہونچاتا ہے۔یہ حرف راز جو مولانا کی زبان سے نکلا مدرسہ کے حلقے میں حرف مسموع نہ بن سکا۔مدرسے کے اصاغر سے لے کر اکابر تک سب دینی اور دنیوی جدید اور قدیم کی تقسیم کے قائل رہے۔چشمے سے پانی لینے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالنے کا مولانا علی ندویؒ کا پیغام قدیم طرز کے مدارس کے عالی مقام ذمہ داروں نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ان حضرات نے مولانا کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔تبلیغ اور درس نظامی کے دینی اداروں کے ذمے دار اور دیگر بزرگ علماء مولانا علی میاں ندویؒ کا بہت احترام کرتے تھے لیکن کسی کے پاس وہ گوش حقیقت نیوش نہ تھا جو مولانا کی باتوں کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے تیار ہو جاتا۔

مولانا سے لوگوں کو عقیدت تھی لیکن یہ عقیدت قبول حق اور کسی تبدیلی اور انقلاب فکر کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ نظام تعلیم وہی رہا، سوچنے کا اسلوب اور انداز جوں کا توں قائم رہا۔ جمود وتعطل میں کوئی کمی نہیں آئی اور انسانیت کی قیادت سے کنارہ کشی اسی طرح باقی رہی، زندگی اور زمانے کا دھارا اسی طرح بہتا رہا اور علماء اس میں کسی تبدیلی سے قاصر رہے۔ ندوہ نے اور ندوہ کے طرز کے دوسرے مدارس نے وہ صلاحیتیں طلبہ میں ضرور پیدا کر دی تھیں کہ شائستہ، شگفتہ اور سلیس اردو میں علمی، اسلامی اور تاریخی موضوعات پر تصنیف وتالیف کا کام کریں۔ ندوہ نے وہ صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی کہ وہاں کے بہت سے فارغین عربوں کو خطاب کر سکیں اور ان کا مقام یاد دلا سکیں اور عربی زبان میں علمی کام کر سکیں لیکن مغربی ملکوں کے لئے اور جدید تعلیم یافتہ غیر مسلموں سے گفتگو کرنے کے لیے جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے ایسے باصلاحیت علماء نہیں پیدا ہو سکے جو ان کی زبان میں یعنی انگریزی میں اور مقامی زبانوں میں یعنی ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ان کو اسلام کی دعوت دے سکیں، جس کا خواب علامہ شبلی نے دیکھا تھا۔ ندوۃ العلماء کے نصاب میں مزید اصلاح کی اور انقلاب کی ضرورت تھی جو بوجوہ نہ ہو سکی۔

پیغمبرانہ مشن کے لئے امت کو کھڑا ہونا ہے تو کثیر تعداد میں ایسے علماء کو سامنے آنا ہوگا جو ''لسان قوم'' سے آشنا ہوں، زبان شناس ہوں، لسان قوم کے ادیب اور خطیب ہوں اور صحافی ہوں جن کی نگارشات پڑھی جائیں، جن کی تقریریں گوش دل سے سنی جائیں۔

اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے مخاطب کی زبان پر عبور حاصل کرنے کی اہمیت قرآن کی دوسری آیتوں سے بھی ثابت ہے۔ قرآن میں حکم ہے: وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل:۱۲۶)۔ یہاں قرآن مجید میں ''مجادلہ'' انٹلکچول ڈبیٹ یا اکیڈمک ڈبیٹ کے مفہوم میں ہے۔ اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے اس ڈبیٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ متکلمین اسلام نے یہ مجادلہ اپنے اپنے زمانہ میں کیا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان اور دوسرے متعدد علماء کے مناظرے مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے ولیم میور کی کتاب کا علمی جواب لکھا۔ سرسید کا دل سر ولیم میور کی کتاب پڑھ کر ان ہی کے الفاظ میں ''کباب'' ہو گیا تھا۔ یہ اس شخص کے الفاظ ہیں جو انگریزوں سے بہت قریب تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کو مشہور مستشرق مارگولیتھ سے تحریری مناظرہ کرنا پڑا تھا۔ ان علمی مناظروں میں ترجمے کا کام دوسروں کو کرنا پڑتا تھا۔ بہت سے مدرسوں میں مناظروں کے لئے طلبہ کو تیار بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن اس مجادلے کے لئے سب سے بہتر تیاری زبان پر عبور حاصل

کرنا ہے۔وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ میں احسن کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ زبان پر عبور ہو اور شگفتہ بیانی ادبی حیثیت اختیار کرجائے۔مکالمہ بین المذاہب عصر حاضر کا چیلنج ہے اور اس چیلنج میں کامیاب وہی ہوگا جسے مخاطب کی زبان پر عبور ہو۔کاش ہمارے دینی مدارس کے ذمے دار حضرات لسان قوم کی اہمیت کو سمجھ سکیں تاکہ پیغمبرانہ مشن کو دوبارہ زندہ اور تابندہ کیا جاسکے۔

دعوت توحید، انذار آخرت، معبودان باطل کی نفی اور اسلام کی تلقین یہ وہ پیغمبرانہ مشن ہے جسے مشرکانہ سوسائٹی میں اہل دین کو اختیار کرنا ہے اور لسان قوم میں اختیار کرنا ہے۔افسوس کی بات ہے کہ اسے نہیں اختیار کیا گیا اور تمام کوششیں مسلمانوں کی اصلاح کے محور پر گردش کرنے لگیں، یہاں تک کہ یہ بھی کہا جانے لگا کہ خود مسلمانوں میں اتنی برائیاں موجود ہیں کہ اب کفار اور مشرکین کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں یعنی پیغمبرانہ مشن سے اعراض پر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔لیکن عقائد کی اصلاح کے علاوہ بھی کچھ ضرورتیں ہیں جن کے لئے لسان قوم پر، خاص طور پر بین الاقوامی زبانوں پر، عبور ضروری ہے۔

دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔گذشتہ نصف صدی سے بھی کم کا عرصہ ہوا دنیا میں تہذیبی تصادم کا نظریہ سامنے آیا ہے۔امریکی مفکر سموئیل ہینگٹنٹن (۱۹۲۷-۲۰۰۸ء) نے ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' Clash of Civilizations کے نام سے کتاب لکھی۔پوری دنیا میں اس کی اتنی اشاعت ہوئی کہ شاید ہی کسی اور کتاب کی ہوئی ہو۔اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دنیا کی تہذیبوں کو اسلام سے خطرہ ہے۔ اس نے مغربی دنیا کو ایک بڑے متوقع تصادم سے خبردار کیا۔اس نے اسلام کو ایک خطرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نے متوقع جنگ کے لئے مغرب کو تیار کرنا چاہا ہے اور اسلام کے خلاف ماحول بنانے کی کوشش کی ہے۔جدید دور میں عالمگیریت یعنی گلوبلائزیشن کے فلسفہ نے ذہنوں پر قبضہ کیا۔جس نظام عالمگیریت کو مغربی مفکرین قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی کنجیاں مغربی ساہوکاروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کا ایک مقصد اسلام کی شکست وریخت ہے۔ہر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمیں مغرب سے موثر اور طاقتور مکالمے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک بہت بڑی نعمت عطا کی ہے وہ ہے بیان وتعبیر کی طاقت Power of Expression - یہ علمه البیان (الرحمٰن:۴) کی نعمت ہے۔اس نعمت کا حصول دین اسلام کی نصرت کے لئے طالبان علوم نبوت کا فریضہ ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں اور جدید علم کلام

وارث مظہری
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی
wmmazhari@jamiahamdard.ac.in

بیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہند و پاک میں جن شخصیات نے علم کلام کو اپنی فکر وتحریر کا خصوصی موضوع بنایا ان میں مولانا وحیدالدین خاں (م:۲۰۲۱ء) کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں اور مقالات تحریر کیے۔ تاہم جو کتاب اس حوالے سے ان کے وسیع تعارف اور شہرت کا عنوان بنی، وہ ''مذہب اور جدید چیلنج''[1] ہے جو مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ God Arises:Evidence of God in Nature and in Science سے اشاعت پذیر ہوا، جب کہ عربی میں اس کا ترجمہ ''الاسلام یتحدی'' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں بیروت اور کویت سے عمل میں آیا اور عالم عرب میں اس کو خصوصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ متعدد عرب جامعات کے فکر اسلامی کے نصابات میں اس کو شامل کیا گیا۔ عالم عرب میں مولانا کی علمی شخصیت کا تعارفی حوالہ دراصل یہی کتاب بنی۔ اس کے علاوہ ''عقلیات اسلام''، ''مذہب اور سائنس'' اور ''تجدید دین'' جیسی کتابوں میں بھی انہوں نے جدید تناظر میں کلامی مسائل و موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

جدید علم کلام کے حوالے سے معاصر دنیا میں دو رجحانات پائے جاتے ہیں: جدیدیت پسند رجحان کے مطابق، جدید علم کلام کی تشکل کے تعلق سے اصل مسئلہ خود دین کے روایتی اور متوارث تصور پر از سر نو غور وخوض اور اس کی باز تشکیل کا ہے، جب کہ اس کے مقابل روایت پسند رجحان کے

۱۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ''علم جدید کا چیلنج'' کے عنوان سے سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

مطابق ،اصل مسئلہ جدید اسلوب اور سائنٹفک دلائل کے ذریعے ان تصورات کے از سر نو انطباق اور ان کی تائید و استحکام کا ہے۔مولانا اس دوسرے رجحان کے حامل ہیں اور اس لحاظ سے وہ روایتی مسلم حلقہ ہائے فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔مولانا کا خیال ہے کہ قدیم علم کلام کی اہمیت زمانے کی تبدیلی کے ساتھ قطعی طور پر ختم ہوچکی ہے اس لیے اس سے مکمل نجات ضروری ہے[۲]۔اب گویا ایسے جدید علم کلام کی ضرورت ہے جو اپنے اصل منہج و مشمول کے لحاظ سے بالکل جدید ہو۔ایسا علم کلام ہی جدید فکری تقاضوں کی تکمیل کرسکتا ہے۔مولانا نے کس احساس کے تحت جدید علم کلام پر قلم اٹھایا اس کا اندازہ ان کے اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور (انیسویں اور بیسویں صدی) میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لاسکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو[۳]۔

مولانا وحید الدین خاں نے قدیم متکلمین کے طرز پر مذہب کی ضرورت ،وجود باری، رسالت، آخرت اور اعجاز قرآنی پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان کے ثبوت وحقانیت پر عقلی دلائل قائم کیے ہیں۔ان کا بنیادی کلیہ وہی ہے جسے مذہب کے اثبات میں دور جدید میں بہ کثرت استعمال کیا جاتا رہا ہے اور اقبال نے زیادہ فلسفیانہ تعمق اور توسع کے ساتھ اسے برتا ہے۔وہ یہ ہے کہ حقیقت علم کے حصول کا واحد ذریعہ صرف مشاہدات و تجربات نہیں ہیں۔ بہت سے غیر مرئی اور نا قابل مشاہدہ حقائق کا اثبات صرف منطقی استدلال کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ بہت سے سائنسی حقائق کی بنیاد بھی بجائے خود ایسے مفروضات پر مبنی ہے جو اسی نوع کے منطقی استدلال و استنباط کی اساس پر طے کیے گئے ہیں۔مولانا کے مطابق، سائنس کے شعبے میں جن حقائق کو مشاہداتی حقائق کہا جاتا ہے وہ دراصل مشاہداتی حقائق نہیں بلکہ مشاہدات کی تعبیریں ہیں۔اس کے باوجود سائنس داں ایک مفروضے کو، جو اس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، مشاہداتی حقائق سے کم درجے کی علمی حقیقت نہیں سمجھتا۔وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشاہداتی حقائق تو سائنس ہیں لیکن وہ نظریہ جو اس کی

۲۔مولانا وحیدالدین خاں، تجدید دین: مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۱-۶۲

۳۔مولانا وحیدالدین خاں، فکر اسلامی: مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۷۵

تشریح کرتا ہو وہ سائنس نہیں ہے[۴]۔ مذہب بھی اسی منہج پر کام کرتا ہے۔ وہ بھی سائنس کے مفروضہ کلیات ونظریات کے طرز پر غیر مشہود پر یقین (ایمان بالغیب) کے ذریعے مشہود حقائق کی تعبیر وتوجیہ کرتا ہے۔ اس طرح مخالفین مذہب کا یہ مقدمہ غلط قرار پاتا ہے کہ مذہب کو سائنسی اور عقلی اسلوب میں ثابت نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ وہ انسانی مشاہدات وتجربات سے ماورا ہے جب کہ حقائق وہی ہیں جن کا اثبات عقلی مشاہدات وتجربات پر مبنی ہو۔

اس لیے مولانا کی نظر میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سائنسی مسلمات کے مقابلے میں مذہبی مسلمات واصول کی توجیہ کی جائے اور دفاعی طرز اختیار کیا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ طریق استدلال کا ہے۔ سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مذہب کی طرف سے حقیقت کی دریافت کا طریقہ وجدانی اور اعتقادی ہے، سائنسی اور عقلی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا طریق کار بھی علت ومعلول پر مبنی عین سائنسی ہے اور مذہبی استدلال اور سائنسی استدلال میں کوئی فرق نہیں ہے[۵]۔

''مصنوع'' کے ذریعے ''صانع'' کے وجود وصفات پر استدلال کا طریقہ ابتدا سے، خصوصیت کے ساتھ، متکلمین کے درمیان رائج رہا ہے۔ ابن رشد نے ''دلیل الاختراع'' اور ''دلیل العنایۃ'' کے ذریعے اس سے بحث کی ہے۔ ابن رشد سے قبل یہ بحث ابن سینا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ جدید فطرت پسند (Naturalist) ملحدین کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی توجیہ فطرت سے کرتے ہیں ۔یعنی یہ کہ کائنات ومظاہر کائنات کی پوری حرکت فطری قوانین کے تابع ہے۔ اہل مذہب کا سوال یہ رہا ہے کہ فطرت اور اس کے مزاج کی ایسی تشکیل کیوں کر ممکن ہوئی؟ اگر اسے محض اتفاقی فرض کرلیا جائے تو یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ اس میں اس قدر ضبط واتقان (Accuracy) اور تنظیم کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہوگئی؟ اقبال کی نظر میں اس دلیل سے بجائے خالق کے صرف ایک صانع کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کو مسترد کردیا۔ مولانا متکلمین کے موقف اور طرز استدلال سے اتفاق کرتے ہوئے وجود باری کے اثبات کے لیے اسی دلیل کو استعمال کرتے ہیں[۶]۔

۴۔ مولانا وحیدالدین خاں، مذہب اور جدید چیلنج: مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۱

۵۔ مولانا وحیدالدین خاں، عظمت اسلام: مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۷

۶۔ ماخذ سابق، ص ۵۳

مولانا کا اصل کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کچھ نئے اصول وکلیات کی تشکیل کی ہو، جس طرح ہمیں سرسید، شبلی اور زیادہ وسیع پیمانے پر اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔ بلکہ اصل کارنامہ اثبات عقائد کے باب میں اس اصول کا عملی انطباق ہے جس کی اہم خصوصیت بصورت دعویٰ یہ ہے کہ جن مزعومہ سائنسی نظریات کی بنیاد پر موجودہ دور میں مذہب کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے ہیں، مولانا نے انہی اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے ان کا رد کیا ہے۔ ان کے دعویٰ کے مطابق، اس عمل میں انہوں نے سائنسی زبان واسلوب کو ہی اختیار کیا ہے اور اس باب میں درست منہج یہی ہے: ''مذہب کے بارے میں ہمارے یقین کا ماخذ عین وہی چیز ہے جو ایک سائنس داں کے لیے کسی سائنسی نظریے کے بارے میں ہوتا ہے''[۷]۔

اس پر تو یقیناً بحث ہوسکتی ہے کہ آخری تجزیے میں اس سائنسی زبان واسلوب اور سائنس کے مسلمہ اصول وکلیات پر بحث کی بنا رکھنے کی حقیقت کس حد تک درست ہے؟ تاہم عام قارئین جو سائنس وفلسفے کے نظریات ومباحث اور ان کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہیں، ان کا عمومی تاثر یہی ہوتا ہے کہ اس سے مذہب پر ملحدین کے اعتراضات کا دفاع ہو جاتا ہے۔ روایتی علمی وعوامی حلقوں میں مذکورہ کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) کی غیر معمولی مقبولیت و پذیرائی کا راز یہی ہے اور اس معنی میں بلاشبہ یہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ اقبال نے بھی ''خطبات'' میں اسی موقف کا اظہار کیا ہے کہ مذہب کو جو فکری چیلنجز اس وقت درپیش ہیں، ان کا ماخذ جدید فلسفہ وسائنس ہے۔ اس لیے ان کا جواب اسی کی زبان ومحاورات میں دیا جانا چاہیے اور ان کی کوشش کی نوعیت یہی ہے۔ تاہم اس حوالے سے اقبال اور مولانا وحیدالدین خاں کی فکر کے درمیان جوہری فرق یہ ہے کہ اقبال مذہبی ایقان کو سائنسی ایقان کے متوازی درجے میں رکھنے کی کوشش نہیں کرتے، نہ ہی وہ اس کے مدعی ہیں کہ ایسا ممکن ہے۔ اقبال کے نزدیک مذہبی ایقانات کے حصول میں دراصل فرد کا اپنا وجدان اور داخلی تجربہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، جب کہ مولانا وحیدالدین خاں کی نگاہ میں سائنس موجودہ زمانے میں اسلام کی تھیالوجی بن چکی ہے[۸]، یعنی مذہبی حقائق کے کلی اثبات کا ذریعہ موجودہ سائنس اور اس کا طریق فکر واستدلال ہے۔

۷۔ مذہب اور جدید چیلنج، ص ۵۲

۸۔ تجدید دین، ص ۶۷

اسی طرح اقبال یہ تصور رکھتے ہیں کہ ان کی اس جہت میں یہ کوشش بنیاد ساز ضرور ہے لیکن اس سے متعلق قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس تعلق سے بس اپنے حصے کا کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ آنے والی نسلوں پر موقوف ہے کہ وہ اس کی تنقید و تنقیح کا فریضہ انجام دیں اور اس کے مثبت عناصر کو اختیار کر کے اس کام کو آگے بڑھائیں[9]۔

اس کے مقابلے میں مذہبی حقائق کے اثبات میں مولانا کا نقطۂ نظر اپنے اندر ایسی حتمیت رکھتا ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مولانا کی طرف سے سادہ علمی اسلوب میں قابل فہم ''مثالوں'' اور ''حوالوں'' سے جس طرح براہ راست سائنسی دعووں کی تردید کی گئی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ایک طبقہ عوام وخواص کے ذہنی کنفیوژن کو دور کرنے اور مذہب پر اس کے متزلزل اعتماد کو بحال کرنے میں یہ کوشش معاون نہ ہو۔ اسی وجہ سے خاص طور پر عالم عرب میں ان کی اس باب کی کوششوں کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اپنی بعض کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود مولانا وحیدالدین خاں کی جدید کلامیات کی تشکیل کے باب میں کی جانے والی مساعی نے برصغیر ہند کے جدید کلامی افق پر نمایاں اثرات قائم کیے۔

وحیدی منہج فکر پر ایک تنقیدی نظر:

مولانا وحید الدین خاں کی کلامی کاوشوں کی اپنی اہمیت کے باوجود، جس سے انکار ممکن نہیں، اگر گہرائی کے ساتھ اس کتاب اور مصنف کی دوسری کتابوں کے مشمولات کا تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل حقیقت سامنے آتی ہے:

- سائنسی نظریات یا ان کی بنیاد پر تشکیل یافتہ ذہنیت کے رد میں قطعیت سے پُر جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس میں بکثرت مقامات پر ایک نوع کی علمی سادگی اور سطحیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ایک دو مثال ملاحظہ کریں:

> چوتھائی صدی گزری تھی کہ خود سائنس کی دنیا میں ایسی تحقیقات سامنے آنا شروع ہو گئیں جنہوں نے ان تمام مفروضات کو بالکل منہدم کر دیا جن پر علمی الحاد کی بنیاد کھڑی کی گئی تھی... ساری مغربی دنیا کی نئی

۹۔ Mohammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Oxford University Press, London, 1934, Preface-vi

نسل میں وہ جوابی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کو غلط طور پر 'اینٹی سائنس' کہا جاتا ہے"[۱۰]۔

اسی طرح وہ مزید لکھتے ہیں:

۱۹ویں صدی کا خاتمہ درحقیقت ان تمام (الحاد کے مؤید) نظریات کا بھی خاتمہ تھا۔ موجودہ صدی میں خود سائنس نے جو حقائق دریافت کیے ہیں، انہوں نے ان سارے خیالات کی آخری طور پر تردید کر دی ہے"[۱۱]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عہد روشن خیالی (Enlightenment) کے ملحد فلاسفہ کے نظریات کے زیر اثر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں الحادی فکر کو جو تقویت حاصل ہوئی، اس کے خلاف بیسویں صدی میں پے بہ پے مضبوط ردعمل آنا شروع ہوا اور اس پر بحثیں ہونے لگیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس نے مذہب کے خلاف قائم کردہ تمام تصورات کی عمارت کو بالکل منہدم کر دیا، ایک نادرست تجزیہ ہے۔ اسی طرح ''ساری مغربی دنیا کی نئی نسل میں علمی الحاد کے خلاف جوابی تحریک کا پیدا ہونا'' محض مبالغہ آرائی بلکہ بظاہر کم نظری کی دلیل ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر رقم کردہ اپنی اکثر کتابوں میں اسی نوع کے مبالغوں سے یہ فضا بنائی ہے کہ ایک عام قاری یہ تأثر لے سکتا ہے کہ بظاہر جدید سائنس و فلسفے کے ذریعے مذہبی فکر کو درپیش چیلنجز اب باقی نہیں رہے بلکہ ان کا شافی جواب دیا جا چکا ہے۔ معاندین مذہب جولین ہکسلے، اگسٹ کومٹے اور نتشے کے نظریات کے جواب میں کتابوں کے لکھے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ مذہب کے خلاف سائنسی نظریات و دعاوی کی عمارت ''منہدم'' ہو گئی۔

- مصنف کے اسلوب کا دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ مصنف کے اسلوب پر بکثرت مقامات پر تذکیری اور واعظانہ رنگ حاوی ہو گیا ہے جو علمی اور استدلالی زبان کے لیے موزوں نہیں ہے[۱۲]۔

- مولانا کے انداز بحث کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں انتخابیت پسندی (Selectivism) کی وہی روش اختیار کی گئی ہے جسے اس موضوع پر لکھنے بولنے والے مصنّفین و مقررین استعمال کرتے ہیں۔

۱۰۔ مولانا وحید الدین خاں، عقلیات اسلام، ص ۵

۱۱۔ ماخذ سابق ص ۱۱۲

۱۲۔ مذہب اور جدید چیلنج، ص ۲۱۹۔۲۲۰

یعنی کسی مذہب مخالف نظریے کے رد میں صرف ان مصنّفین و اسکالرز، خصوصاً مسیحی مبلغین ، کے موقف کو پیش کرنا جن سے اپنے موقف کی تائید ہوتی ہو اور دوسرے اسکالرز کی ان آراء کو، خواہ وہ کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہوں، یکسر نظر انداز کر دینا جو اس موقف کے رد میں اپنے دلائل کے ساتھ پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

- ایک درجے میں اس منہج کا نقص بھی وہی ہے جو سرسید کے منہج فکر میں پایا جاتا ہے کہ بعض سائنسی نظریات وتصورات کو بنیاد بنا کر اسلام سے متعلق ایک حتمی موقف طے کرنے کی کوشش کی جائے، جس کی صحت کا دار و مدار صرف سائنسی موقف کی صحت و درستگی پر ہو۔

مولانا کی کوشش اس امر کو ثابت کرنے پر مرکوز ہے کہ مذہبی تیقنات اپنے اندر سائنسی قطعیت رکھتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے متوازی رکھنا نہ صرف ممکن بلکہ عین حقیقت ہے۔ لیکن یہ دعویٰ معروضیت سے خالی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مذہبی ایمان و ایقان میں سائنسی قطعیت بجائے خود مذہب کی طرف سے مطلوب نہیں ہے، کیوں کہ بقول اقبال ''مذہب طبیعیات یا کیمسٹری نہیں ہے''[۱۳]۔ غیب اور شہود میں فرق مذہب کا ایک بنیادی کلیہ ہے جس پر مذہب کی مابعد الطبیعیات کی اساس قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کسی پیغمبر، وحی اور معجزات کی ضرورت باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس منہج فکر کا ایک بڑا نقص ہے کہ وہ مذہب، سائنس اور فلسفے کے سوالات کا دائرہ اور ماخذ ایک ہی تصور کرتا ہے اور ان میں باہم فرق نہیں کرتا۔ اس نوع کا دعویٰ بجائے خود مذہب اور سائنس دونوں کو ایک ہی دائرۂ فکر میں لاتا ہے۔ اب اس صورت میں مذہب کے لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ سائنس کی طرح اسے تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں تپا کر اس کی مصداقیت (Credibility) ثابت کرنے کی کوشش جائے اور یہ فرض کیا جائے کہ جس طرح سائنسی علم ترقی پذیر ہے، اسی نہج پر مذہبی علم کو بھی ترقی پذیر ہونا چاہیے[۱۴]۔

ڈاکٹر منظور احمد نے اپنی کتاب ''اسلام چند فکری مسائل'' میں اس پہلو پر عمدہ بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ غلط فہمی مذہب، فلسفہ اور سائنس کے حوالے سے پائی جاتی ہے کہ یہ تینوں ایک ہی قسم

۱۳۔ The Reconstruction, p.24

۱۴۔ عظمت اسلام، ص ۴۲۔

کے بنیادی سوالات کے جواب میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی قسم کے جواب فراہم کرتے ہیں یعنی فلسفہ و مذہب ان سوالات کا جواب کلی طور پر دیتے ہیں جب کہ سائنس جزوی طور پر اس کا جواب فراہم کرتی ہے۔ یہ بداہتاً غلط ہے۔ مذہب اور سائنس حقیقت کے دو مختلف پہلوؤں سے اعتنا اور بحث کرتے ہیں:

> اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ پانی کیسے بنا اور اس کا جواب دیا جائے کہ پانی خدا نے بنایا ہے تو یہ جواب اس سوال کے ایک خاص معنی کا جواب ہے جو دوسرے معنوں سے جس کا جواب یہ ہے کہ پانی ہائڈ ریوجن اور آکسیجن کے امتزاج کا نام ہے، قطعاً ممیّز ہے[۱۵]۔

مصنف کے بقول اگسٹ کومٹے کا مفروضہ (کہ انسانی فکر تین ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا مذہبی، دوسرا مابعدالطبیعیاتی اور تیسرا سائنسی جو اس وقت موجود ہے) اسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کومٹے یہ فرض کرتا ہے کہ فلسفہ مذہب کا اور سائنس فلسفے کا بدل ہو سکتی ہے، کیوں کہ مثلاً وجود خدا کے بارے میں ان تینوں نے ایک ہی قسم کی باتیں مختلف انداز میں کہی ہیں[۱۶]۔ یہ اس سائنسی منہج فکر پر ایک بہت مضبوط نقد ہے جس کی صحت ذرا سے غور و فکر سے واضح ہو سکتی ہے۔ مولانا وحید الدین خان کے یہاں بنیادی مذہبی تصورات کے اثبات میں غیر علمی استدلال کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں: تصور آخرت کی واقعیت و حقیقت کے اثبات کے لیے یہ ''تجرباتی شہادت'' انھوں نے قلم بند کی ہے کہ مسوری (امریکہ) میں ایک شخص کو ایک ہوٹل میں اپنے کام کے دوران یہ محسوس ہوا کہ اس کی بہن جو ۹ سال قبل وفات پا چکی تھی، موجود ہے اور اس کے چہرے پر ایک واضح خراش موجود ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے اس کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ اس سے اتفاقاً یہ خراش لڑکی کی لاش کی تدفین سے قبل اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی، جس کا علم اس کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔ مولانا کا استدلال یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کو وہم و خیال نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا لڑکی کو[۱۷]۔

۱۵۔ ڈاکٹر منظور احمد، اسلام چند فکری مسائل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸

۱۶۔ ماخذ سابق، ص ۱۹

۱۷۔ مذہب اور جدید چیلنج، ص ۱۱۷۔۱۱۸

اس طرح مولانا نے ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، سائیکیکل ریسرچ (Psyshical Research) وغیرہ کی مثالوں کو رسالت کے اثبات میں استعمال کیا ہے۔ وہ آٹو میٹزم (Automatism) سے آخرت پر دلیلیں لاتے ہیں، جس کا تصور یہ ہے کہ مردہ آدمی کی روح زندہ شخص کے اندر سرایت کر گئی ہے اور وہ ایسے واقعات کی خبر دے رہا ہو، جس کا اسے پہلے سے علم نہ ہو[۱۸]۔ ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا عوامی توہمات کو کس طرح سائنسی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس نوع کے استدلال کی مثالیں مولانا کی تحریروں میں بکھری پڑی ہیں۔ درحقیقت مغربی دنیا میں مادیت پسندی اور اس سے پیدا شدہ الحاد کے رد کے لیے ایک فطری ردعمل کی صورت میں جو لٹریچر تیار ہوا، وہ مولانا کے پیش نظر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس استدلالی طریق کار میں دو خرابیاں در آئیں: ایک تو یہ کہ انہوں نے حوالوں اور مثالوں میں علمی معیار کی پابندی نہیں کی اور ان میں بہت سی رطب و یابس چیزیں شامل ہو گئیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے مذہب اور علم جدید کے درمیان فاصلے کو ختم کرنے میں بنیادی طور پر مذہب مخالف مغربی ذہنیت کو سامنے رکھا اور اسی کے فکری اور استدلالی فریم ورک میں مذہبی موقف کو پیش کرنے کی کوشش کی جس سے متعدد مسائل میں خلط مبحث کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

مولانا کا خیال ہے کہ علم کلام حقیقتاً قرآنی عقلیات کو مرتب کرنے کا نام ہے، مگر عباسی دور کے متکلمین نے اسے انسان کی وضع کردہ فلسفیانہ عقلیات پر ڈھالنے کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے علم کلام میں قدیم و جدید کے تصورات پیدا کیے کیوں کہ فلسفیانہ عقلیات قیاسی ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر تھی جب کہ قرآنی یا کائناتی عقلیات میں تغیر و تبدل کا کوئی سوال نہیں[۱۹]۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے جس 'سائنٹفک' طرز استدلال سے علم کلام کی تشکیل کی کوشش کی ہے وہ کس لحاظ سے اپنی ماہیت میں قرآنی علم کلام ہے جب کہ دور عباسی کے متکلمین کا کام غیر قرآنی فریم ورک میں آتا ہے۔ عباسی دور کے متکلمین، ابوالحسن اشعری اور غزالی و رازی نے وقت کے موجود علمیاتی (Epistemological) فریم ورک کو استعمال کرتے ہوئے اسلامی فکر کو درپیش سوالات کا

۱۸۔ ماخذ سابق، ص ۱۱۸

۱۹۔ تجدید دین، ص ۶۵

عقلی جواب دینے کی کوشش کی۔ یہی کام اب جدید سائنس کے حوالے سے متکلمین عصر کا ایک طبقہ کررہا ہے جس میں مولانا بھی شامل ہیں۔

مولانا کا یہ موقف بھی نظری تشدد اور ناقص تجزیے پر مبنی ہے کہ قدیم علم کلام مکمل طور پر دریا برد کر دینے کے لائق ہے[۲۰]۔ علم کلام کے بنیادی موضوعات: وجود باری، توحید، رسالت، آخرت، قضا و قدر وعلی ہذا دوسرے بنیادی مسائل میں قدیم علم کلام کے بہت سے مباحث کی معنویت ہنوز تازہ اور برقرار ہے۔ اس کو علمی فہرست سے خارج کر دینے کا انتہا پسندانہ موقف بظاہر صرف ایک ذہنی افتاد کی پیداوار ہے۔

بہرحال یہ چند ملاحظات اپنی جگہ تاہم اس میں شک نہیں کہ جدید علم کلام کے باب میں مولانا وحیدالدین خاں کی مساعی اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ مخصوص اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا کے بعد ہندو پاک میں اصحاب علم کی صفوں سے ایسے اہل قلم سامنے نہیں آسکے جو جدید علم کلام کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کو آگے بڑھا سکیں۔

۲۰۔ ماخذ سابق، ص ۶۲

مدارس دینیہ میں جامعہ نظامیہ کا مقام ومرتبہ

ڈاکٹر راہی فدائی

9448166536 / 7760292050

جامعہ، دارالعلوم اور مدرسہ یہ دینی تعلیمی اداروں کے اصطلاحی نام ہیں، ان کو عصری تعلیمی اداروں کے ناموں کا متبادل نہ سمجھا جائے۔ اس لئے کہ جامعات، دارالعلوم اور مدارس کے الفاظ یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہائی اسکولوں کے معنوں میں مستعمل ہونے کے باوجود ان میں تخصیص کا پہلو باقی نہیں رہا۔ یہ امرِ مسلّم کہ جامعہ باقیات صالحات، ویلور، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۸۶۲ء)، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، یوپی (قائم شدہ ۱۹۰۸)، جامعہ دارالسلام عمرآباد، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۹۲۴ء)، جامعہ رحمانیہ، مونگیر، بہار (قائم شدہ ۱۹۲۷ء) وغیرہ بہت سی جامعات یقیناً علوم دینیہ کی یونیورسٹیاں ہیں، اسی طرح دارالعلوم، دیوبند، یوپی (قائم شدہ ۱۸۶۶ء)، دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۸۸۴ء)، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، یوپی (قائم شدہ ۱۸۹۴ء)، دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور، کرناٹکا (قائم شدہ ۱۹۶۰ء) کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے کئی دارالعلوم اپنی معیاری اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بجاطور پر یونیورسٹی کے ہم پلّہ ضرور ہیں۔ پھر مدارس دینیہ کی بات کریں تو مدرسہ منبع الانوار، لال پیٹ، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۸۶۵ء)، مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی (قائم شدہ ۱۸۶۶ء)، مدرسہ ریاض العلوم، باپوپور، مرشدآباد، مغربی بنگال (قائم شدہ ۱۸۷۴ء)، مدرسہ معدن العلوم، وانم باڑی، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۸۸۸ء)، مدرسہ منظرالاسلام، بریلی، یوپی (قائم شدہ ۱۹۰۴ء)، مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن، ڈھابیل، گجرات (قائم شدہ ۱۹۰۸ء)[۱] وغیرہ بے شمار مدارس اپنے نظام تعلیم اور وسیع تدریسی خدمات کے مدنظر بجاطور پر گریجویشن کے کالج کہلانے کے مستحق ہیں۔ مذکورہ بالاحقائق کے باوجود اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ مدارس کے تعلیمی نظام میں اصول

۱۔ قدیم ہندستان میں علوم دین کے سرچشمے، راہی فدائی ڈاکٹر، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء۔ ص ۵۲-۶۴

وقواعد کا کوئی ضابطہ اخلاق موجود نہیں ہے۔ اس المیہ کا سبب ایک غیر منضبط طریقۂ کار ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شہروں میں جابجا پھیلے ہوئے مکاتب دینیہ جہاں محلّہ کے بچوں کو اور اسکول کے طلبہ کو صبح وشام کے اوقات میں قرآن مجید ناظرہ پڑھایا جاتا ہے یا بعض مدرسوں میں شعبۂ حفظ اور ابتدائی دینیات کا اہتمام کیا جاتا ہے، ان مکتبوں اور مدرسوں کے نام لفظ ''جامعہ'' سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً جامعہ ابوہریرۃ ؓ، جامعہ عمر فاروق ؓ، جامعہ طلحہؓ، جامعہ عثمان غنی ؓ، جامعہ ابوبکر صدیق ؓ، جامعہ حسان بن ثابتؓ وغیرہ۔ اس طرح کے بے دریغ رویہ کو قوم چپ چاپ برداشت کر رہی ہے۔ ان ناموں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی بڑی شاندار یونیورسٹیاں ہیں۔ اس کے برعکس کبھی یہ نہ سنا اور نہ دیکھا گیا کہ کسی کالج یا ہائی اسکول کا نام ''یونیورسٹی'' رکھا گیا ہو۔ یہ دنیا دارالاسباب ہے، جو قوم ضابطۂ اخلاق اور اصول مراتب کا لحاظ نہیں رکھتی اس قوم سے کامیابی وکامرانی کی توقع فضول ہے، اسی بے قاعدگی اور بے اصولی کی وجہ سے معتبر ومستند الفاظ اپنے حقیقی معنے کھودیتے ہیں، ان کا پس منظر بدل جاتا ہے، اور ان کی تہذیبی وثقافتی معنویت کالعدم ہوکے رہ جاتی ہے۔ آج سے آٹھ صدیاں پیشتر لفظ ''مدرسہ''یونیورسٹی کے مترادف سمجھا جاتا تھا جیسا کہ ''مدرسہ بیہقیہ'' (نیشاپور، ایران)، مدرسہ نظامیہ (بغداد، عراق) مدرسہ محمد فاتح (استنبول، ترکی) کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے، مگر جب صدیوں بعد مدرسہ کی معنویت کا بیڑا غرق ہوا تو لفظ مدرسہ مکتب کے ہم معنی قرار پایا۔ متحدہ ہندوستان کی اولین جدید یونیورسٹی ۸۷۶ھ مطابق ۱۴۷۱ء میں جنوبی ہند کی عظیم الشان حکومت ''سلطنت بہمنیہ'' کے آخری فرمانروا سلطان محمد شاہ بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے وزیر اعلیٰ خواجہ عمادالدین محمود گاواں شہید (شہادت ۱۴۸۱ء) کے ہاتھوں قائم ہوئی اور صدیوں تک جاری رہی، شہر ''بیدر'' (کرناٹک) میں واقع اس تاریخی باوقار وباعظمت یونیورسٹی کا نام ''مدرسہ محمود گاواں'' تھا[۲]۔

اس طویل تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جس جامعہ کی خصوصیات وامتیازات پر بحث مقصود ہے، وہ حقیقی معنوں میں جامعہ یعنی یونیورسٹی ہے، جس میں دینی علوم میں پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ۔ڈی کی تعلیم وتدریس کا عمدہ اور معیاری انتظام ہے۔ یہ جامعہ نظامیہ ایک ایسی مرکزی درسگاہ ہے جس کے تحت سینکڑوں مدارس تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، جامعہ نظامیہ درحقیقت ایک ایسا شجرۂ طوبیٰ ہے جس کی ہزاروں شاخیں، پھولوں، پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، جن سے لاکھوں افراد

۲۔ ماخذ سابق، ص ۳۵۔۳۶

فیضیاب ہور ہے ہیں، یہ بات ذہن نشین رہے کہ جامعہ یا دارالعلوم فلک بوس عمارت کا نام نہیں ہے اور نہ طلبۃ العلوم کی کثرت کسی مکتب کو جامعہ میں تبدیل کر سکتی ہے۔ جامعہ درحقیقت اعلیٰ تعلیم اور معیاری نصابِ درس کا نام ہے، اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کسی بھی جامعہ اور دانش گاہ کا خصوصی وصف اور کامل امتیاز اوّلاً اس کے مؤسس و بانی کی خصوصیات و امتیازات پر مبنی ہے۔ بعد ازاں اس کے نصب العین اور افراد سازی کے باعث تخصیص کی خوبی اپنا اثر دکھاتی ہے۔

شہر حیدر آباد (دکن) کے قلب میں جلوہ گر برصغیر کی عظیم دانش گاہ "جامعہ نظامیہ" جو ۱۹/ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء تک "مدرسہ نظامیہ" کے نام سے موسوم تھی[۳]۔ یہ کسی آصف و نواب یا حاکم و امیر کی قائم کردہ نہ تھی، بلکہ اس مقتدر جامعہ کی تاسیس علامۂ زماں عارف باللہ شیخ الاسلام حافظ محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ (ولادت ۱۲۶۴ھ وفات ۱۳۳۶ھ) خلیفۂ خاص امام العارفین حاجی حافظ امداد اللہ مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) کے مبارک ہاتھوں بتاریخ ۱۹/ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء بروز دوشنبہ ہوئی، قیامِ مدرسہ کے اسباب و اغراض سے متعلق مشاہیر علما اور مقتدر صلحا کی مجلس میں بالاتفاق یہ طے پایا کہ:

> حیدر آباد جیسی اسلامی ریاست میں ایک ایسی مذہبی درسگاہ کی شدید ضرورت ہے جو علم دین کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے، مذہب کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے، اگر چندے یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہ کہیں ملک مذہب سے بےگانہ نہ ہوجائے۔
>
> (مدرسہ کے) اخراجات کے لئے قوم خصوصاً اہل خیر حضرات سے استدعا کی جائے کہ دامے درمے ماہانہ مقررہ یا یک مشت، اعانت سے ثواب دارین حاصل کریں۔
>
> عوام اہل اسلام، شرفا اور اہل خدمات شرعیہ سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنے بچوں کو اس درسگاہ میں بھیج کر تعلیم دلائیں، اور ہو سکے تو وہ بھی صحیح تعلیمات مذہب سے فلاح دین و دنیا حاصل کریں۔
>
> اہل سنت والجماعت کے طریقے پر مدرسہ نظامیہ میں علوم عربیہ دینیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جائے گی، دوسرے طریقہ پر تعلیم دینا خلاف اصول ہوگا، کسی وقت اس میں تغیر و تبدّل نہ ہو سکے گا[۴]۔

۳۔ تاریخ جامعہ نظامیہ حصۂ اول، محمد فصیح الدین نظامی مولانا ناشاہ، الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد، ۲۰۲۲ء، ص ۱۵۷

۴۔ ماخذ سابق، ص ۷۱۔۷۲

جامعہ نظامیہ کے بانی علیہ الرحمہ کے حسنِ نیت وللّٰہیت ہی کی برکت تھی کہ یہ دانش گاہ اپنے وجود کے روز اوّل سے راہ ترقی و ترویج پر گامزن رہی۔ بقول مولانا مفتی رکن الدینؒ، تلمیذ و خلیفۂ بانی جامعہ (متوفی ۱۳۴۷ھ):

> مدرسہ نظامیہ کی شہرت کے ساتھ ساتھ طلبا کی تعداد بھی بڑھتی گئی، آخر نوبت بایں جا رسید کہ صرف اہلِ خیر کی امداد پر مدرسہ کو چلانا مشکل ہوگیا، اب دوصورتیں پیش تھیں یا تو طالب علم کو ناکام و نامراد رکھا جاتا یعنی طلبا کا داخلہ بند کر دیا جاتا یا اخراجات کی تکمیل کے لئے کوئی دوسری سبیل کی جاتی، بالآخران اسباب سے مجبور ہوکر حکومت سرکار عالی سے امداد کی درخواست کی گئی جس کی بناپر پہلے پہل ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۰۹ء میں پچاس روپے ماہوار امداد منظور کی گئی مگر مدرسہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے لحاظ سے یہ امداد بالکل ناکافی ثابت ہوئی اور امداد کے لئے پھر دوسری درخواست کی گئی اور منظور ہوئی، حتیٰ کہ اعلیٰ حضرت نواب میرعثمان علی خاں بہادر خلدہ اللہ ملکہ وسلطنتہ تخت نشین ہوئے اس وقت مدرسۂ نظامیہ کو سرکار سے سات سو روپیہ امداد ملتی تھی اور حال یہ تھا کہ وہ بھی ناکافی، اس پر مولانا (بانی مدرسہ حضرت انواراللہ فاروقیؒ) نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تمام حالات کا اظہار فرمایا جس کا علم دوست والیٔ ملک کے درد بھرے دل پر بہت اثر ہوا اور شاہ والا جاہ نے اسی وقت کُل امداد دوہزار ماہوار کردی اور اس کے بعد مزید پانچ سو کا اضافہ منظور فرمایا، چنانچہ تا حال (۱۳۴۷ھ تک) ڈھائی ہزار ماہوار امداد سرکار سے مل رہی ہے[۵]۔

بانی جامعہ نظامیہ، حیدرآباد، علامہ شیخ الاسلام حافظ انواراللہ فاروقی علیہ الرحمہ کی عظیم شخصیت کے چند پہلو ایسی خصوصیات سے مزیّن ہیں جو ہندو پاک کے کسی بھی بڑے سے بڑے مدرسہ کے بانی کو حاصل نہیں۔ ان میں سے اہم ترین خصوصیت یہ کہ حضرت شیخ الاسلام بیک وقت سلطنت کے حکمرانوں کے بھی استاذ و اتالیق تھے اور ریاست کے عوام و رعایا کے بھی معلّم و مربی رہے۔ چنانچہ وہ ۱۲۹۵ھ میں ریاست حیدرآباد کے حکمران آصف جاہ ششم نواب میرمحبوب علی خاں (متوفی ۱۳۲۹ھ) کے استاذ مقرر ہوئے جبکہ نواب موصوف بارہ سال کے اور مولانا انواراللہ اکتیس کی عمر کے تھے۔ نواب میرمحبوب علی خاں کو اپنے استاذ سے بے حد عقیدت و محبت تھی، نواب صاحب نے اس کا اقرار کرتے ہوئے فرمایا:

۵۔ ''مطلع الانور'' محمد رکن الدین حضرت مولانا مفتیؒ۔ جمعیۃ الطلبہ ء، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد، ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء، ص ۶۹

مجھے جو کچھ حاصل ہوا، مولانا (انوار اللہ) ہی سے حاصل ہوا۔

جب شاگرد رشید نواب موصوف کی تخت نشینی ۱۳۰۱ھ میں ہوئی تو نواب صاحب نے اپنے استاذ گرامی کی قدر افزائی کرتے ہوئے انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب اور منصب یک ہزاری عطا کیا، شیخ الاسلام انوار اللہ فاروقیؒ حج و زیارت سے مشرف ہوکر ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد لوٹ آئے تو میر محبوب علی خان نے اپنے فرزند میر عثمان علی خان (ولادت ۱۳۰۳ھ وفات ۱۳۸۷ھ) کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری ان کے سپرد کردی، یہ تعلیم کا سلسلہ میر عثمان علی خان کے آصف سابع مقرر ہونے اور ۷/رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ کو تخت نشیں ہونے تک جاری رہا[۶]۔ علاوہ ازیں آصف سابع نے اپنے دونوں صاحبزادوں نواب اعظم جاہ بہادر (متوفی ۱۹۷۰ء) ولی عہد سلطنت آصفیہ اور نواب معظم جاہ بہادر (متوفی ۱۹۸۷ء) کی اتالیقی کا ذمہ بھی بتاریخ ۱۲/ربیع الاول ۱۳۳۲ھ آپ ہی کو تفویض فرمایا اور اسی سال جشن سال گرہ کے موقع پر شیخ الاسلام کی خدمت میں ''فضیلت جنگ'' کا خطاب بڑے ادب و اہتمام کے ساتھ پیش کیا[۷]۔

نواب میر عثمان علی خاں نظام ہفتم نے بتاریخ ۲۳/رجب المرجب ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء آپ کو ناظم امور مذہبی وصدر الصدور صوبہ جات دَکن کے منصب پر فائز فرمایا، پھر تقریباً دو سال کے بعد نواب مظفر جنگ بہادر معین المہام امور مذہبی کی وفات حسرت آیات کے بعد نظام ہفتم نے نظم و نسق کی اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کی وجہ سے شیخ الاسلام انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ کو وزارت امور مذہبی کے جلیل القدر عہدے پر باصرار متمکن فرمایا، اس عظیم منصب پر آپ اپنے وصال یکم/جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک فائز رہے[۸]۔ حضرت شیخ الاسلام نے مذکورہ سرکاری ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سرانجام دینے کے باوجود اپنے مدرسۂ نظامیہ میں باقاعدہ درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا، جہاں سینکڑوں ملکی و غیر ملکی تشنہ گان علم وعرفان آپ کے سرچشمۂ فیضانِ ذات سے سیراب ہوتے

۶۔ حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقی نوراللہ مرقدہٗ شخصیت، علمی وادبی کارنامے، محمد عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر، مجلس اشاعت العلوم، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد، ۲۰۰۰، ص ۸۳

۷۔ مطلع الانوار، ص ۲۵

۸۔ ماخذ سابق، ص ۲۴-۲۵

رہتے تھے۔ یہ امتیاز خصوصی کہ ایک طرف ریاست کے حکمرانوں کی تین نسلوں کی تعلیم وتربیت کا بیڑا اٹھانا اور دوسری طرف مدرسہ میں طلبۃ العلوم کی نہ صرف سرپرستی کرنا بلکہ انہیں زیورِ علم سے آراستہ کرنا اس قدر غیر معمولی وصف ہے جو برصغیر ہندوپاک کے کسی بھی جامعہ یا دارالعلوم کے بانی ومؤسس کے کارناموں کا حصہ نہ بن سکا۔ حالانکہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایسے سلاطین وحکمران کے تذکرے موجود ہیں جنہوں نے دن میں کاروبار سلطنت کو سنبھالتے ہوئے رات میں درس وتدریس کے ذریعہ طالب علموں کی علمی پیاس بجھائی۔ مگر چونکہ یہ خود حاکم وقت تھے اس لئے حکمرانوں کو تعلیم دینے کا عمل وشغل ان کے لئے غیرضروری اور تحصیل حاصل تھا۔ جیسا کہ بہمنی سلطنت کا آٹھواں حکمران سلطان تاج الدین فیروز شاہ بہمنی (عہد حکومت ۷۹۹ھ تا ۸۲۵ھ) بڑا عالم وفاضل اور جید شاعر تھا۔ بقول پروفیسر ہارون خان شیروانی:

> ہندوستان کے حکمرانوں میں فیروز کا شمار فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے اور دوسرے ذی علم بادشاہ محمد تغلق کے مقابلے میں یہ کمتر نہ تھا، عمدہ خوش نویس ہونے کے علاوہ وہ تفسیر قرآن، اصول قانون، حکمت فلسفہ، صوفی مصطلحات، مکتبی فلسفہ، اقلیدس، فن مناظرہ اور ریاضیات میں بھی ماہر تھا، اور علوم کے ہر شعبہ سے دلچسپی رکھتا تھا، یہاں تک کہ اس نے ہر ہفتہ میں تین دن ان علوم میں خود باضابطہ تعلیم دینے کے لئے مخصوص کر لئے تھے [9]۔

علاوہ ازیں دکن کے اسی بہمنی سلطنت کے تیرھویں حکمران سلطان محمد شاہ بہمنی (متوفی ۸۸۷ھ مطابق ۱۴۸۲ء) کے وزیر اعظم خواجۂ جہاں عماد الدین محمود گاواں شہید (شہادت ۸۸۶ھ م ۱۴۸۱ء) تلمیذ امام المحدثین حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (متوفی ۸۵۲ھ) نے ۸۷۶ھ مطابق ۱۴۷۲ء میں شہر محمد آباد، بیدر (موجودہ صوبہ کرناٹک) کے بیچوں بیچ ہندوستان کی اولین اسلامی یونیورسٹی تعمیر کی، اس سہ منزلہ عمارت کا رقبہ دوسو پانچ (۲۰۵) فٹ لمبائی اور ایک سواسّی (۱۸۰) فٹ چوڑائی کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس مدرسہ میں ہزاروں طلبۃ العلوم کا قیام تھا، مدرسہ کے تمام اخراجات مدرسہ کے مؤسس و بانی خواجہ محمود گاواں تن تنہا برداشت کرتے تھے اور دن بھر امور سلطنت میں مصروف رہنے کے بعد شب میں دیر تک مدرسہ میں طلبا کو تفسیر، حدیث، منطق، کلام اور ہندسہ وریاضی کی خود تعلیم دیتے تھے [10]۔

۹۔ دکن کے بہمنی سلاطین، ہارون خان شروانی، مترجم رحم علی الہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۷

۱۰۔ قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے، ص ۳۵

اسی طرح بعض ایسے جید علما و صلحا جنہوں نے اپنی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی نذر کردی تھی، اپنے وقت کے حکمرانوں کے اتالیق مقرر ہوئے چنانچہ علامہ باقر آگاہ ویلوری (ولادت ۱۱۵۸ھ وفات ۱۲۲۰ھ) کو والیٔ کرناٹک نواب محمد علی والا جاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) نے اپنے دونوں صاحبزادوں نواب عمدۃ الامرا اور نواب امیر الامرا کی تعلیم و تربیت کے لئے مامور فرمایا تھا، آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں نواب والا جاہ نے اپنے فرزندوں کو حکم دیا کہ تم اپنے استاذ محترم کو طلائی گہوارہ ہدیہ کرو اور اس میں استاذ کو بٹھا کر جھلاؤ۔ علامہ آگاہ نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گہوارے میں بیٹھنے سے انکار کر دیا[۱۱]۔ شہر مدراس کے ایک نامور عالم و بلند پایہ شاعر علامہ غلام محی الدین معجز مدراسی (ولادت ۱۱۷۳ھ وفات ۱۲۲۹ھ) بھی حاکمانِ وقت کے معلم و مربی رہے ہیں۔ بقول مولانا محمد یوسف کوکن عمری:

جب معجز کی فارسی کی غیر معمولی قابلیت کا شہرہ بڑھا تو نواب امیر الامرا بہادر (متوفی ۱۲۰۳ھ) ابن نواب محمد علی والا جاہ نے اپنے فرزند عبدالعلی خاں کا جو آگے چل کر عظیم الدولہ (متوفی ۱۲۳۴ھ) کے لقب سے سریر آرائے ریاست کرناٹک ہوئے تھے، (علامہ معجز کو) اتالیق مقرر کیا...... جب نواب عظیم الدولہ تخت پر بیٹھے تو انہوں نے اپنے استاذ کی قدردانی کرنی چاہی، دیوان (وزیر اعظم) کے عہدے کے لئے معجز پر ان کی نظر پڑی مگر انہوں (معجز) نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں تو غلام محی الدین (یعنی حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ) کا غلام ہوں، کسی اور کی کیوں کر غلامی کر سکتا ہوں؟ نواب عظیم الدولہ نے ان کے اس آزادانہ جواب کو برا نہ مانا، ان سے گزارش کی کہ ہونے والے ولی عہد نواب اعظم جاہ کو اپنی تربیت میں لیں اور انہیں علمی و ادبی حیثیت سے سنوارنے کی کوشش کریں۔ معجز نے یہ درخواست مان لی اور اعظم جاہ کی دل و جان سے تربیت کی[۱۲]۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ علامہ باقر آگاہؒ ہوں یا معجز مدراسیؒ، ان کا مرتبہ حکمرانوں کے اساتذہ کرام کے طور پر ضرور مسلّم تھا مگر یہ اکابر مستقل درس و تدریس سے وابستہ نہ تھے، جب کہ جامعہ نظامیہ کے بانی شیخ الاسلام انوار اللہ فاروقیؒ نوابان ریاست کے اتالیق ہونے کے ساتھ ہی مدرسہ میں تعلیم و تعلم سے بھی وابستہ تھے۔ یہ اعزاز و امتیاز صرف اور صرف برصغیر ہند و پاک میں شیخ الاسلام ہی کو حاصل ہے۔

۱۱۔ جنوب کے اصحاب کمال (جلد اول) راہی فدائی ڈاکٹر، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۴۰

۱۲۔ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ جلد اول محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء، دارالتصنیف، مدراس، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۴

حضرت شیخ الاسلام کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف آپ کو درس وتدریس سے بے انتہا اشتیاق اور غیر معمولی لگاؤ تھا، دوسری طرف آپ کا اشہبِ قلم تصنیف وتالیف کے میدان میں جولانیاں دکھا رہا تھا۔ بقول آپ کے شاگرد وسوانح نگار مولانا مفتی محمد رکن الدینؒ:

مولانا (حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقی) کی کل مؤلفات کم وبیش چالیس (۴۰) تک پہنچی ہیں، جو زمانے کی ضروریات کے مطابق تالیف کی گئیں اور بجز ایک دو کے تقریباً سب چھپ چکی ہیں جن میں سے بعض کو مولانا نے اپنے ذاتی صرفہ سے طبع کروایا، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اکثر کتابیں دوبارہ، سہ بارہ طبع ہوئی ہیں[۱۳]۔

مگر پروفیسر الیاس برنی کی اطلاع کے مطابق آپ کی جملہ تصانیف وتالیف کی تعداد بشمول ''مقاصد الاسلام'' کے گیارہ اجزا، ایک سو (۱۰۰) ہے[۱۴]۔ امور وزارت کی ذمہ داریاں، درس وتدریس کی مشغولیت اور اس پر تصنیف کردہ کتابوں کی اس قدر کثرت، عقل حیران ہے کہ یہ ممکن کیسے ہوا، یہ کرشمہ سازیاں ''ذلک من فضل اللہ یوتیہ من یشاء'' کے مصداق رب تعالیٰ کا عطیہ ہے جو اپنے بندگان خاص کو عنایت فرماتا ہے۔ اس خصوصیت میں بھی وہ منفرد ہیں۔ حالانکہ شیخ الاسلام سے صدیوں پیشتر سلطان القلم حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ (ولادت ۷۲۰ھ وفات ۸۲۵ھ) نے اپنی ایک سو پانچ سالہ طویل حیات میں ایک سو پانچ کتابیں تصنیف کیں، آپ کے مرید وخادم خاص مولانا شاہ محمد علی سامانی نے اپنی مؤقر تصنیف ''سیر محمدی'' (تاریخ تصنیف ۸۳۱ھ) میں حضرت گیسودراز کی کتابوں کی تعداد ایک سو پچیس (۱۲۵) بتائی ہے[۱۵]۔ اسی طرح علامہ شاہ عبدالحی احقر بنگلوری خلیفۂ خاص حضرت سید شاہ عبداللطیف نقویؒ (قطب ویلور) (ولادت ۱۲۳۵ھ وفات ۱۳۰۱ھ) نے بھی ایک سو پچیس (۱۲۵) کتابیں تصنیف کیں، حضرت احقر کے فرزند و جانشین مولانا شاہ محمد عبدالقادر علی صوفی (متوفی ۱۳۱۴ھ) کا بیان ہے کہ:

۱۳۔ مطلع الانوار ص ۶۰

۱۴۔ قول طیب (فصل نہم) الیاس برنی پروفیسر، مرتب ملفوظات پروفیسر برنی محمد عبدالحلیم الیاسی، ڈیلکس پرنٹر، مہدی پٹنم، حیدرآباد، طبع سوم، ۲۰۱۹ء۔ ص ۴۰۶

۱۵۔ جنوب کے اصحاب کمال (جلد اول) ص ۲۲

کثیرالتصانیف والتوالیف صاحب تصرفات و حالات، رئیس الواعظین، کثیرالمریدین حاجی وزائرحرمین شریفین المتوفی بین الحرمین ۲۲؍محرم ۱۳۰۱ھ مترجم بخاری جناب حضرت والد ماجد مولانا مولوی شاہ عبدالحی صاحب واعظ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن سے عمر ۶۶ سالگی میں ۱۲۵ کتابیں بحسب احتیاجِ زماں، نظماً ونثراً تصنیف پائیں، فیض رسان عالم ہوئیں [۱۶]۔

حضرت بندہ نواز اور حضرت شاہ عبدالحی کثیرالتصانیف یقیناً رہے مگر یہ دونوں بزرگ کسی جامعہ کے بانی اور مؤسس نہیں تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تدریسی خدمات کے ہم دوش کثیر تصنیفی مشاغل میں منہمک رہنے کا ہنر بانی جامعہ نظامیہ کا ہی وصف خاص اور آپ ہی کا امتیاز ہے۔

جامعہ نظامیہ، حیدرآباد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے فارغین و فاضلین میں بے شمار علماء و مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیہ، مدرسین، واعظین اور مختلف عصری علوم کے ماہر ہوئے، ان میں سے بعض عالمی شہرت یافتہ اور اپنے فن کے امام کہلائے، مثلاً حضرت علامہ سید محمود شاہ معروف بہ ابوالوفا افغانیؒ (ولادت ۱۳۱۰ھ وفات ۱۳۹۵ھ) تلمیذ خاص حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ بانی وصدر ''مجلس احیاء المعارف النعمانیہ'' ومعاون خاص ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' کی ذاتِ گرامی قابل ذکر ہے۔ علامہ ابوالوفا کی فقہی خدمات خصوصاً فقہ حنفی کے حوالے سے جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کا اعتراف ساری علمی دنیا تاحال کر رہی ہے۔ ''معارف نعمانیہ'' کا تعارف کراتے ہوئے علامہ شاہ محمد فصیح الدین نظامی رقمطراز ہیں:

اس مجلس کے قیام کا مقصد حضرت سراج الامہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب (مثلاً حضرت امام ابو یوسف، امام محمد زفر، امام حسن بن زیاد وغیرھم رحمہم اللہ) اور آپ کے اصحاب کے اصحاب (جیسے امام ثلجی، امام خصاف، امام طحاوی، امام کرخی، امام جصاص رازی وغیرھم) کی گرانقدر تصانیف کو شائع کرنا ہے، جو ان پیشوایان دین کی عرق ریزی اور جانکاہی کے نتائج ہیں [۱۷]۔

علامہ ابوالوفا افغانی نے حجاز، دمشق، مصر، بیروت، قسطنطنیہ، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے مختلف شہروں اور کتب خانوں سے فقہی مخطوطات حاصل کر کے ان کی تحقیق، تخریج اور تصحیح کے ساتھ بیسیوں کتابیں

۱۶۔ ماخذ سابق ص ۴۰۴

۱۷۔ تاریخ جامعہ نظامیہ، (حصہ اول) ص ۳۴۳

شائع فرمائیں، جو عرب وعجم کے دینی مراکز و مدارس میں ماخذ کی حیثیت سے متعارف ہیں۔

فرزندان جامعہ نظامیہ میں برصغیر کے نامور محدث حضرت علامہ سید عبداللہ شاہ نقشبندی مجددی (ولادت ۱۲۹۲ھ وفات ۱۳۸۴ھ) شاگرد رشید حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ، معروف بہ ''محدث دکن'' عرب وعجم میں مشہور و معروف ہیں، آپ نے ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے طرز پر معرکۂ آراء کتاب ''زجاجۃ المصابیح'' تصنیف فرمائی، جس میں فقہ حنفی کی کامل رعایت کی گئی ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ گرانقدر کتاب علمی دنیا کے لئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ ''زجاجۃ المصابیح'' پر اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۹۳۳ء) نے کہا:

> اس عظیم الشان حدیثی تالیف کے مطالعہ کے بعد معترضین و معاندین کو بھی اس امر کے اعتراف سے چارۂ کار نہ ہوگا کہ امام اعظم کے اقوال علاوہ حدیث کے کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کے اقوال سے ماخوذ ہیں، اس لئے امام صاحب پر اعتراض کرنا صحابی یا تابعی پر اعتراض کرنے کے برابر ہے [۱۸]۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (متوفی ۱۹۷۷ء) رقمطراز ہیں:

> اس میں قطعاً اختلاف نہیں ہے کہ ایسی کتاب (زجاجۃ المصابیح) علمائے احناف ایک ہزار سال سے نہیں لکھ سکے ہیں [۱۹]۔

عرب کے نامور مصنف علامہ ابوالفتاح ابوغُدّہؒ نے ''زجاجۃ المصابیح'' (جلد اول) کے مطالعہ کے بعد مصنف موصوف کو بتاریخ ۱۴ محرم ۱۳۷۷ھ اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

> (حج و زیارت کی) ان گرانقدر منفعتوں میں سے میرے لئے ایک منفعت یہ ہے کہ مجھے حضرت والا کی تصنیف ''زجاجۃ المصابیح'' کی جلد اول دستیاب ہوئی، جس کی وجہ سے میری بصر اور بصیرت دونوں روشن ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جو اس بیش بہا نعمت سے نوازا ہے اس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر پر اسلام اور حضرات احناف کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے [۲۰]۔

عالمگیر شہرت یافتہ محقق و مصنف، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نائطی نظامی (ولادت ۱۹۰۸ء وفات ۲۰۰۲ء) کا

۱۸۔ تاریخ جامعہ نظامیہ (حصہ دوم) ص ۱۶۴

۱۹۔ ماخذ سابق، ص ۱۴۶

۲۰۔ ماخذ سابق، ص ۱۶۳

شمار فرزندان جامعہ نظامیہ کے مشاہیر واکابر ہستیوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں اولین ترجمہ کیا[۲۱]۔ آپ نے اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ مستشرقین کی غلط بیانیوں یا غلط فہمیوں کی اصلاح فرمائی۔ یوروپ کے اہل علم اور اہل دانش وبینش طبقے میں آپ کا بجاطور پر اعتماد کیا جاتا ہے اور آپ کی تصنیفات کا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ آپ نے کئی بیش بہا کتابیں تصنیف کیں، ان میں ''الوثائق السیاسیۃ'' کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے تین سو سے زائد خطوط و دستاویزات بڑی تحقیق سے شامل کی گئی ہیں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں قاہرہ (مصر) سے اشاعت پذیر ہوا، اس کے بعد پے در پے اس کے ایڈیشن عرب اور یوروپ کے ممالک میں شائع ہوتے رہے ہیں، یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

مذکورہ بالا اہل علم وفضل اور اصحاب تصنیف وتالیف کا تذکرہ ''مشتے از خروارے'' کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ جامعہ نظامیہ کے فارغین وفاضلین میں چندے آفتاب وچندے مہتاب کے مصداق ہر کوئی نیّر اعظم ہے۔ علاوہ ازیں عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے مایہ ناز ادبا وشعرا اسی جامعہ کے خوشہ چیں ہیں، مثلاً عربی شاعری میں یدطولیٰ رکھنے والی شخصیت کا اسم گرامی علامہ سید ابراہیم ادیبؔ رضوی (ولادت ۱۲۹۵ھ وفات ۱۳۷۷ھ) ہے، مشہور مستشرق مصنف انسائیکلوپیڈیا پروفیسر مارگولیتھ نے حضرت ادیب رضوی کے متعلق کہا ''میں نے ہندوستان بھر میں عربی ادب کا ایسا ماہر نہیں پایا[۲۲]۔ مولانا محمد عبدالجبار صوفی ملکاپوری (متوفی ۱۹۲۵ء) دکن کے عظیم محقق تھے، حضرت صفی اورنگ آبادی (متوفی ۱۹۵۴ء) حضرت امجدؔ حیدرآبادی (متوفی ۱۹۶۱ء) جامعہ نظامیہ کے ہی فیض یافتہ تھے۔ اسی طرح علامہ مفتی رکن الدین (متوفی ۱۳۴۷ھ)، علامہ مفتی رحیم الدین (متوفی ۱۳۸۹ھ) علامہ مفتی عبدالحمید (متوفی ۱۳۷۹ھ) وغیرہ بے شمار اساطین علم اس سرچشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کئے ہوئے تھے، ان کے علاوہ عربی تحقیقات وتعلیقات میں جن اہل علم کا حصہ رہا ان میں مولانا مفتی محمد عظیم الدین نظامی (۱۹۳۹ء۔۲۰۲۱ء) مولانا حافظ عزیز بیگ نظامی (ولادت ۱۹۳۳ء)، مولانا مفتی محمد عبدالحمید نظامی

۲۱۔ عظیم اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد ناصر سعید اکرمی، معہد الامام حسن البنا، بھٹکل، ۲۰۲۲ء، ص ۲۳

۲۲۔ مطلع الانوار، ص ۶۱

(متوفی ۱۹۷۷ء)، مولانا مفتی حافظ ولی اللہ قادری نظامی (متوفی ۲۰۰۶ء)، مولانا ابوبکر محمد الہاشمی (متوفی ۲۰۰۸ء) وغیرہ محققین و دیگر علوم وفنون کے ماہرین مثلاً پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید نظامی مولانا قاری محمد عبداللہ قریشی ازہری (متوفی ۲۰۱۵ء)، مولانا قاری انصار علی قریشی نظامی (متوفی ۱۹۹۶ء) وغیرھم نے اپنے انمٹ نقوش تاریخ علم وادب کے صفحات پر ثبت کئے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک اور اہم اطلاع دینی ضروری ہے کہ شیخ الاسلام بانی نظامیہ حضرت انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ نے جامعہ نظامیہ کی تاسیس سنہ ۱۲۹۲ھ کے بعد کتابوں کی طباعت واشاعت کے لئے ''انجمن اشاعت العلوم'' قائم فرمائی، جس کے لئے ۱۳۳۰ھ میں سرکار عالی سے ماہانہ پانچ سو روپے جاری کئے گئے۔ اس ادارے نے اتنا عظیم کام کیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، ایک قلیل مدت میں ''اشاعت العلوم'' سے عربی میں اٹھارہ (۱۸) فارسی میں دو (۲) اور اردو زبان میں چھپن (۵۶) کتابیں شائع ہوئیں۔ (۲۱) خصوصاً علامہ محمد غوث شرف الملک بہادر نائطی مدراسی (ولادت ۱۱۶۶ھ وفات ۱۲۳۸ھ) کی معرکہ آرا تصنیف ''نثر المرجان فی رسم القرآن'' کی سات جلدیں ''اشاعت العلوم'' سے شائع ہوئیں۔ شرف الملک ڈاکٹر محمد حبیب اللہ نظامی کے پردادا تھے، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضور شہر مدراس کے قاضی القضاۃ حضرت علامہ محمد صبغۃ اللہ معروف بہ قاضی بدرالدولہ (ولادت ۱۲۱۱ھ وفات ۱۲۸۰ھ) تھے، یہ خود بھی کثیر التصانیف بزرگ رہے ہیں، بانی نظامیہ حضرت انوار اللہ کو علامہ قاضی صاحب کی علمیت اور آپ کی للّٰہیت کا اعتراف واحترام تھا، علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد حاجی ابومحمد خلیل اللہ (ولادت ۱۲۷۴ھ وفات ۱۳۶۳ھ) شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کے نوجوان معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اوپر ذکر کردہ دلائل وشواہد سے یہ بات روز روشن کی طرح صاف وشفاف اور ظاہر و باہر ہو جاتی ہے کہ جامعہ نظامیہ، حیدرآباد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ برصغیر کے تمام مشہور ومعروف جامعات، دارالعلوم اور مدارس دینیہ میں اپنے بانی شیخ الاسلام حضرت فضیلت جنگ محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ اور اس جامعہ کے منتسبین و مکتسبین کے علمی کمالات اور اس کے فیض یافتہ افراد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے نہ صرف اعلیٰ مقام ومرتبہ کی حامل ہے بلکہ اک گونہ انفرادیت واعزاز وفضیلت کی مستحق ہے۔

عصر غالب اور ایک شعر

محمد طارق غازی

کل شام بستر پر دراز تھا کہ غالب کا ایک شعر اچانک ذہن میں کوندا.

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

شعر یاد آیا تو ذہن ایک طویل سفر پر نکلا جو ۱۸۵۷ء کے آس پاس شروع ہوا اور اب اس لمحہ تک میرے ذہن سے باہر ساری انسانی دنیا میں جاری ہے۔

دہشت گری ایک مرض ہے۔ اس جرثومہ کی ابتدا قدیم یورپ کے بدترین افلاس متعفن گلیوں اور خودسر بادشاہوں کی عیش گاہوں میں ہوئی تھی جہاں صلیبی جنگ کا جنون دنیا کے حسین اور متمدن بیزنطینی شہر قسطنطنیہ کی لوٹ مار اور بربادی کا سبب بنا تھا، حجاج وسفاح، چنگیز وہلاکو، نادر درانی کو بھی وہیں سے اس کی سند ملی تھی۔ آج یہ مرض وبا بن چکا ہے۔ سرمایہ سمیٹتے ہوس کار صنعتی، عالمی سیاسی اور انسانی بدنی جراثیم اب اتنی طاقت پکڑ چکے ہیں کہ مدافعت کی فطری قوت دشت غفلت میں تنہا پڑی ہانپ رہی ہے اور نہیں جانتی کہ فطرت سے وہ تعلق دوبارہ کیسے قائم کرے۔ بادی النظر میں یہ حالات اسی دہشت گری کا تسلسل ہیں جو ۱۸۵۷ء کے ہند میں وبا بن گئی تھی بلکہ اس سے بھی پہلے صنعتی انقلاب کی ایک معادن صنعت تھی جس کی ایک بیٹی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔

یہ آج کا پس منظر ہے، غالب کے زمانہ میں یہ پیش منظر تھا اور تمدن کا حریری نقاب چہرہ پر ڈالے ہوئے تھا۔ البتہ غالب اس نقاب میں چھپے ہوئے مکروہ چہرہ کو فکر کی آنکھ سے دیکھ سکتا

تھا۔ غالب اردو کا پہلا مفکر شاعر تھا، اس کے بعد ہے مکر رلب ساقی پہ صلا، غالب کے متبعین بہت ہوئے، غالب منفرد تھا اب تک منفرد ہے، اس انفرادیت کی چند عجوبہ مثالیں دیوان غالب میں انسان کو تلاش کر رہی ہیں انہی عجوبہ شعروں میں ایک وہ ہے جو چند دن پہلے اچانک یاد آ گیا تھا۔ گزرے برسوں میں جب اس شعر کا عمرانی اضطراب فہم میں نہ آ سکا تو شارحین نے سادگی سے اسے رد کر دیا تھا۔

یوسف سلیم چشتی:

آئینہ فولاد (تانبہ: م ط غ) کے جوہر (معنی زنگ) سبزی مائل ہوتے ہیں اور شعرا ان کو طوطی سے تشبیہ دیتے ہیں اس تشبیہ سے غالب کی قوت تخیل نے یہ نکتہ طرازی کی کہ جب محبوب نے میرے آئینے میں سبز رنگ دیکھا تو اس نے یہ گمان کیا کہ شاید غالب نے کوئی طوطا پال لیا ہے اور میرے بجائے اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

میری رائے میں غالب نے یہ شعر محض قافیہ کی خاطر موزوں کیا ہے اس کے علاوہ اس میں اور کوئی خوبی نہیں ہے (شرح دیوان غالب ۴۲۷)

حامد حسن قادری:

اس شعر میں آئینہ اور طوطی کے مستعار لہ واضح نہیں ہیں اگر استعارہ نہ مانا جائے اور آئینہ اور طوطی کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو شعر کا مضمون نہایت نحیف ہو جاتا ہے کہ معشوق کو بدگمانی ہے کہ غالب نے کوئی طوطا پال لیا ہے اور اگر آئینہ سے دل اور طوطی کے عکس سے کسی دوسرے معشوق کی تصویر مراد لی جائے تو اس پر کوئی قرینہ نہیں ہے (نقد و نظر ۱۵)

دونوں شارحین تفہیم شعر میں سطح لفظ سے اوپر نہ جا سکے اس باب میں فی الحال اس قدر کہنا کافی ہے کہ غالب کے متعدد اشعار کے لفظوں کی معنوی اور اس سے زیادہ ان کے عصر کی زندگی اور اس کی عمرانی گہرائی میں اترنا ضروری ہے۔

مسئلہ غالب کے اشعار اور غزلوں کی توقیت کا بھی ہے کہ کوئی شعر ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے یا اس سے پہلے کا۔ زیر نظر شعر اپنی عمرانی تاثیر کے لحاظ سے ظاہر میں ۱۸۵۷ء کی برطانوی دہشت گری کا نتیجہ لگتا

ہے۔لیکن کالی داس گپتا رضا نے اپنے نسخۂ دیوان غالب میں اس شعر کو نسخۂ حمیدیہ میں ۱۸۳۳ء کی غزلوں میں درج کیا ہے یعنی غالب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اپنے عصر کے حالات اور پیش آمد مصائب کا خاصا گہرا تجزیہ کر چکے تھے۔

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو تو سبھی دیکھ رہے تھے، مگر شاید غالب تنہا تھے جو بگڑتے ہوئے حالات کی سمت اور انگریز کے استبدادی مقاصد کو دیکھنے والی آنکھ بھی رکھتے تھے۔انہیں پتا تھا کہ فرنگی کی جنبش لب سے مقابلہ کی توانائی ہندستانیوں میں نہیں رہی تھی انہوں نے ۱۸۲۱ء میں کہا تھا:

مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یہ بے بسی کی انتہا تھی، اور پھر ۳۱ رسال بعد ۱۸۵۲ء میں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ قوم مجنوں فرہاد کے قصوں اور قد وگیسو کے پیچ وخم میں الجھی ہوئی تھی اور اسے آنے والے وقت کی سنگینی اور خطرات کا کوئی اندازہ نہیں تھا:

قد وگیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار ورسن کی آزمائش ہے

حالانکہ اسی ۱۸۵۲ء میں حال یہ تھا کہ:

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

آیئے اس پس منظر میں دیکھیں ۱۸۳۳ء میں انگریزوں کی روایتی دہشت گری کی کیا صورت تھی۔اس باب میں برطانوی پارلیمان نے خود اپنی تاریخ پر ایک مجمل رپورٹ شائع کی ہے۔اپنی تاریخ کے اس بیان میں برطانوی پارلیمان نے اعتراف کیا ہے کہ برطانوی (کمپنی) کے گورے نوکروں کا روایتی امتیاز ان کا ''تکبر (high-handed) اور ظلم (oppressive)'' تھا جس کے خلاف ۱۸۵۷ء کا انقلاب آیا تھا۔نیز بہت دیر سے سہی رپورٹ میں مجبوراً یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ

''مذاہب کے معاملہ میں کمپنی کی بے حسی (insensitivity) اور کھوئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کے لئے وحشیانہ زیادتیاں'' (excessively brutal action) اس کے جوابی اقدام میں نظر آئیں۔

استعماری دہشت گری کا فساد تو بہت پہلے شروع ہو گیا تھا لیکن صنعت پر اجارہ داری کے نتیجہ میں ۱۸۳۳ء میں قوم پرستی کی صورت میں نسل پرستی کی وبا نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی ایک میثاق کے ماتحت اصولی طور پر برطانوی پارلیمان کے واسطہ سے برطانوی حکومت کا ماتحت ادارہ تھی، ہر ۲۰؍سال میں پارلیمان یک طرفہ طور پر اس میثاق کی تجدید کرتی تھی اور ۱۸۳۳ء کی تجدید میں کمپنی کے واسطہ سے برطانوی حکومت نے طے کیا کہ ہندوستان کو عیسائی پادریوں (کی یلغار) کے لئے کھول دیا جائے اس فیصلہ یا حکم کے بعد مشنری پادریوں کے غول ہند میں در آئے۔ ان کے دلوں کی ٹیس عرب اندلسی اور ترک عثمانی تھے اور ان کا اصل نشانہ مسلمان تھے۔ یہ پادری اسلام کے بارے میں خاصی ناظرہ معلومات رکھتے تھے اور کم علم مسلمانوں کے مجمعوں میں جا کر اسلام پر حملے کرتے تھے۔ آخر مسلمانوں میں ان کا جواب دینے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اٹھے۔ بہرحال ان پادریوں، خصوصاً جرمن نژاد پروٹسٹنٹ انتہا پسند پادری کارل گوٹلیب فنڈر (Karl Gottlieb Pfandar) کی تحریروں اور تقریروں نے بڑا فتنہ پیدا کر دیا تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ کے جرنل (No.1(1976)42-63) میں کسی اے اے پوویل نے اعتراف کیا ہے کہ ''شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے پروٹسٹنٹ مشنری جدو جہد ایک نیا دینی واقعہ تھا'' اور ۱۸۳۰ء کے بعد شمال مغربی صوبہ کے اسلامی تہذیبی مرکزی شہروں میں عیسائیت کی توسیع کا عمل شدت اختیار کر چکا تھا۔

اس فتنہ کا ایک ظاہری پہلو تو خود اسلام اور شعائر دینی سے تھا، لیکن زیادہ سنگین پہلو عمرانی اور معاشرتی ہیجان تھا، مشنری کاموں پر مسلم عوامی ردعمل اور اس پر سرکاری جوابی ردعمل نے معاشرہ میں خاصا انتشار پیدا کر دیا تھا جو کمپنی راج کے اہلکاروں اور پادریوں کی انتہا پسندی کے باعث بالآخر

۱۸۵۷ء کے انقلاب کا سبب بنا۔

یوں ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ایک بڑا فتنہ غالب کے زمانہ میں پیدا ہو گیا تھا۔ غالب نہ عالم دین تھے، نہ مناظرہ اور مباحثہ کے خوگر تھے، نہ اسلامی تہذیب کے دفاع کے سالار یا سپاہی تھے۔ البتہ ایک محکم تہذیب اور اس کی انحطاط پزیر علمی میراث کے امین ضرور تھے۔ بہر حال وہ مسلم معاشرہ سے وابستہ تھے اور ملت کے عمرانی اور سیاسی انحطاط اور زبوں حالی، فکری انتشار، اور معاشرتی بے راہ روی کے اسباب و نتائج سے بے خبر نہیں تھے، مگر متاثر تھے یہی درد ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس حقیقت پر ضروری توجہ نہ ہوئی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور اس کے بعد کی برطانوی سرکاری دہشت گری (terrorism) کا طوفان تباہی مرزا غالب کے سر سے گزرا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی اس ہنگامہ قتل عام اور خونریزی میں مارا گیا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے جاننے والوں کو برباد ہوتے گولیوں توپوں کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مولوی محمد باقر دہلوی، مولانا سید حسن عسکری، میر مہدی مجروح، فہرست ہے کہ غالب کے دل کے داغوں کی طرح ختم ہی نہیں ہوتی، یہاں ۱۸۵۷ء میں کہے ہوئے قطعہ کا ایک شعر توجہ طلب ہے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

اس تصویر کی دوسری طرف بظاہر دستنبو ایک فروتن اور بے حوصلہ شخص کی تحریر لگتی ہے، مگر اس کے درون میں غالب نے اصل میں مسلمانوں ہی کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے باوجود اگر مان لیا جائے کہ وہاں غالب کا مسئلہ پینشن اور ولایتی شراب تھا تو بے شک وہ شاعر کی ذاتی کمزوری تھی، مگر غالب نے ملت کو احساس کمتری کا درس نہیں دیا تھا، جو بعد میں سکہ رائج الوقت بنا، غالب نے فرنگی سے پینشن تو لے لی مگر کوئی خطاب نہیں لیا۔

اس طوفان وحشت نے غالب کے اشعار کا مزاج بدل دیا تھا اگر چہ بربادیوں کی دھمک

انیسویں صدی کے شروع سے غالب کے گوشہ فکر میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی مگر زمانہ وہ تھا کہ کھل کر بات کرنے والے کو برطانوی توپ کے دہانہ پر رکھ کر اڑا دیا جاتا تھا۔ ہنگامہ جنگ سے دو ایک ماہ پہلے، بقول کالی داس گپتا رضا، غالب نے والی رامپور کے نام (چند) راز دارانہ خطوط لکھے تھے ''قوی گمان ہے کہ یہ (وہ) سیاسی امور پر مشتمل تھے اس لئے غالب کی ہدایت پر یہ (وہ) خطوط ضائع کر دئے گئے'' تھے، غالب کے بھائی ''مرزا یوسف علی خان انگریزی فوج کی گولی کا نشانہ بنے (تھے) اگر چہ غالب نے مصلحتاً لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی'' (دیوان غالب نسخہ کالی داس گپتا رضا ص ۱۱۸)

اس فضا میں جو ۱۸۲۱ء سے مسموم ہوتی جارہی تھی فکر انگیز شعر کہنا ممکن نہ تھا تو غالب نے وہ طرز ایجاد کیا جس میں اشعار کے مفاہیم کو کئی کئی کلیدوں کے قفلوں میں چھپا دیا۔ ان کلیدوں کی پکڑ شعر کے دیگر الفاظ اور کلیدی الفاظ سے ان کے خطوط ربط کی تلاش اور پہچان غالب کے کئی اشعار کا اصل مطلب کھولتی ہے ورنہ بظاہر شعر مہمل لگتا ہے تو جو شعر اردو والوں کی سمجھ میں نہ آئے اسے بھلا عیار مگر بے شعور انگریز کہاں پکڑ پاتے۔

ایک شعر میں کئی کئی کلیدیں نظم کر دینے کے فن کے بانی وموجد بھی غالب تھے اور انہی پر یہ فنی کمال ختم بھی ہو گیا۔

ذوق نے بھی اس اسلوب میں شعر کہے تھے، جیسے:

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

اس شعر میں الفاظ اپنے متعین مفہوم میں شعر کو معنی دیتے ہیں قفس = صیاد/ شور = فریاد/ گلشن = طوطی وغیرہ خطوط ربط کو تو متعین کرتے ہیں مگر ان میں کوئی لفظ کلید نہیں ہے۔ میں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں دسمبر ۱۹۷۴ء میں ایک شعر طرز غالب کے اتباع میں کہنے کی کوشش کی تھی:

اقوام میں تقسیم ہوا دودۂ آدم
آغشتۂ تشکیک ملل زخم یقیں ہے

بعض احباب نے شعر پسند کیا، مگر میرے شعر میں دو عیب ہیں ''دودہ'' اور'' آ غشتہ'' اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ غالب حتی الامکان سادہ الفاظ کے ذریعہ مفہوم آفرینی کرتے تھے، سرنامہ پر مذکورہ شعر الفاظ کی سادگی میں ملک پر مسلط خوف و دہشت کے پس منظر میں اپنے معنی کی تہیں کھولتا ہے:

کیا بد گماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

غالب نے اس شعر میں چار کلیدیں چھپائی ہیں۔

آئینہ، طوطی، عکس، زنگار

شعر کے الفاظ ان کی معنوی رسائی اور ان کے باہم خطوط ربط کی تلاش میں کچھ دور جانا ہوگا۔ ان کلیدوں کے خطوط ربط تک رسائی مشکل نہیں، آئینہ ایک طرف مربوط ہے عکس سے اور دوسری طرف زنگار سے، اسی طرح طوطی کا ربط زنگار سے بھی ہے اور عکس سے بھی اور عکس کے حوالہ سے یہ ربط آئینہ تک پہنچتا ہے۔ باقی کلیدوں سے ایسے ہی رابطے زنگار کے بھی ہیں۔

اب دیکھیں غالب نے کہا کیا ہے۔

بدگمان کون ہے؟

شارحین نے ''محبوب'' اور ''معشوق'' مراد لیا ہے۔ یہ پہلی غلطی ہے۔ زنگار محبوب کے تعلق خاطر کا استعارہ نہیں بن سکتا، وہ تو زمانہ کی ہوا اور ایک اعتبار سے اشکوں کی نمی سے پیدا ہونے والا میل ہے جسے عربی میں خُبثُ کہتے ہیں۔ غزل کی اصطلاح میں یہ اشارہ ''رقیب'' یعنی دشمن، اجنبی کی طرف ہے اور ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں یہ رقیب دہشت گرد انگریز کے علاوہ کون ہے، خواہ حاکم اعلی مراد لیا جائے یا حاکم شہر، یا اس کا ایک عام گورا سپاہی جو ٹوہ میں ہے کہ سوچ یا عمل میں انگریز کے بنائے ہوئے نظام کے خلاف ذرا بھی فرق نظر آئے تو گردن اڑا دے۔

آئینہ کا ظاہر ایک پردہ ہے۔ اصل مراد دل ہے ظاہری معنی کا اعتبار کیا جائے تو قدیم زمانہ میں تانبہ کی تختی کو اس قدر صیقل کیا جاتا تھا کہ صورت نظر آنے لگتی تھی۔ تانبہ کا رنگ سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ فولاد (لوہے) کا رنگ نارنگی ہوتا ہے سبز نہیں۔

فارسی لغت وہ خدا میں طوطی کا مطلب ہے کہ ''سبز رنگ کا ایک پرندہ کبوتر کے برابر ہے جو تیز فہم ہوتا ہے'' غالب نے اسی شرح کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے اور اس پر زنگار کو محمول کر کے بظاہر چیستانی شعر کے مفہوم کو ارباب شعور تک پہنچایا ہے۔ سبز رنگ کا رمز بلیغ ہے:

دام سبزہ میں ہے پرواز چمن تسخیر کا

یہ محبت اور اتباع کا رنگ ہے سبز رنگ کی یہ تلمیح قرآن حکیم (الرحمٰن۔۵۵:۶۴/۷۶) سے ماخوذ ہے۔ یہی سبز رنگ حوصلہ مندانہ عمرانی اقدام اور علمی تہذیبی ارتقا کا مبتدا اور منتہا ہے۔ انہی دو حوالوں سے سبز رنگ زمانہ دراز سے مسلمانوں کے ایمان اور حب رسول کی علامت ہے شاعر نے اسے بطور تلمیح اسلام سے وابستگی کے عنوان سے استعمال کیا ہے۔

قصہ مختصر، سادہ لفظوں میں غالب اول تو ایک پرآشوب زمانہ کی تصویر پیش کر رہے ہیں کہ ذرا سی بات پر پکڑ دھکڑ اور موت کی سزا ہو رہی ہے۔ اور ساتھ ہی اہل علم مسلمانوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ رواں برطانوی دہشت گری کے زمانہ میں احتیاط لازم ہے تا وقتیکہ اقدام کے لئے حالات میں مناسب تبدیلی آئے۔

چند عشروں کے بعد اکبرالہ آبادی نے اپنے طنزیہ اسلوب میں یہی بات برملا کہہ دی تھی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اوپر جو کچھ لکھا وہ سب لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جب غالب کا شعر طوطی و زنگار یاد آیا تو اس کی شرح پہلے ایک شعر میں ہوگئی اور پھر اس پر غزل ہوگئی۔ غزل ہم رشتہ ہے۔

https://www.parliament.uk/about/living-heritage/evoulution of parliament/legislativescrutiny/
parliament-and-empire/parliament-and-the-american-colonies-before-1765/
east-india-company-and-raj-1785-1858/

اخبار علمیہ

شارجہ چلڈرن ریڈنگ فیسٹول ۲۰۲۴ء کا انعقاد

ایکسپوسینٹر شارجہ میں ''بی دی ہیرو آف یور اسٹوری'' عنوان کے تحت یکم سے ۱۲ مئی تک شارجہ بک اتھارٹی ''شارجہ چلڈرن ریڈنگ بک فیسٹیول ۲۰۲۴ء'' منعقد کرے گی۔ اس میں دنیا بھر کے ۲۵ ممالک سے تقریباً ۱۹۰ مندوبین شرکت کریں گے۔ لیکچرس اور مباحثوں کے اہتمام کا مقصد قوت خواندگی اور بچوں اور نوجوانوں کے تجربات کو تقویت دینے کی صلاحیت پر روشنی ڈالنا اور مصنّفین، ناشرین اور ادب اطفال پر مشتمل کتابوں کے ناشرین اور ماہرین فن کے تجربات پیش کرنا ہے۔ امید کی گئی ہے کہ مشہور امریکی مزاح نگار جیری کرافٹ اور راؤول ثالث کی شرکت اور فن کا مظاہرہ لوگوں کو خاص طور پر پسند آئے گا۔ مشہور نیوروسائنٹسٹ کیرولین لیف، ملیزیا کے وسٹائسی سی پاور، وینگ انگ جن کا تعلیم اور موسیقی کے میدان میں ۳۰ سالہ تجربہ ہے اور ڈیوڈ چک لنگ اینگو، جارجیا کے مشہور مصنف اور پروفیسر لیہ شالا شویلی اور امریکہ کے تعلیمی ماہر نفسیات ڈاکٹر ال جونز بھی اس مجلس کو رونق بخشیں گے۔ ہندوستان سے ممتا نینی، میتھنی کلارک اور سوہنی مترا بھی شریک ہوں گی۔ مہمانوں اور مندوبین کی فہرست میں کیتھی کیمپر، حنا مشا بیک، لارین تما کی، لیلیٰ بوکریم، جان ماؤنٹ اور زیلماری فیلجوین کے نام بھی شامل ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹ سے جون اسٹیر، میکسیکو کے ڈاکٹر سینڈی زینیلا، نائیجیریا سے ٹوئن اکانی، آئرلینڈ کے ولیم کیلی، اور دیپا زرگر پور جو افغانستان اور متحدہ امارات کی نمائندگی کریں گی کی شرکت متوقع ہے۔ (الشرق الاوسط، ریاض، ص ثقافہ وفنون ۱ر مئی ۲۰۲۴ء)

ایلین کے معدوم ہونے کے متعلق نیا نظریہ

سائنس دانوں میں ایک عرصہ سے یہ خیال عام ہے کہ زمین سے باہر اجنبی زندگی کی ایک شکل (ایلین) موجود ہے لیکن ابھی تک ان مخلوقات اور انسانوں کے درمیان براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہو سکا ہے۔ ڈیلی میل کے مطابق اب اس کے معدوم ہونے کے متعلق ایک ماہر فلکیات نے یہ نیا نظریہ پیش کیا ہے کہ فضائی تہذیبیں، گاما شعاعوں جسے سائنس داں GRB کا نام دیتے ہیں کے پھٹنے سے تباہ اور فنا ہو گئیں۔ یہ دور دراز کی کہکشاؤں میں دیکھے جانے والے انتہائی توانائی بخش دھماکے ہیں اور یہ اس وقت ہوتے ہیں جب ایک بڑے ستارے کے مرکز سے جوہری ایندھن ختم ہوتا ہے اور تابکاری کا ایک بڑا گولہ نکلتا ہے۔ (صحیفہ الوطن، بحرین، ۴ر مئی ۲۰۲۴ء ص ۱۶)

ک،ص اصلاحی

وفیات

شیخ عبدالمجید زندانی (۱۹۴۲-۲۰۲۴ء)

یمن کے معروف عالم، ماہر تعلیم اور سیاستدان

انیس الرحمٰن ندوی

ناظم، فرقانیہ اکیڈمی وقف، بنگلور و مدیر دو ماہی تعمیر فکر

furqania@yahoo.co.in

۲۲/اپریل ۲۰۲۴ء کو استنبول میں عالم اسلام کے مشہور اور متبحر عالم دین شیخ عبدالمجید زندانی کا سانحہ ارتحال پیش آیا جو علمی و دعوتی دنیا کے لئے عموماً اور اعجاز علمی (قرآن و حدیث کے علمی اعجازات) پر کام کررہے علمی حلقوں کے لئے خصوصاً ایک انتہائی غم اندوہ خبر ہے۔ شیخ زندانی کا شماران علماء میں ہوتا ہے جنھوں نے اعجاز علمی کے موضوع پر بڑا کام کیا ہے اور اس کو ایک تحریکی شکل دی۔ آپ کا شمار رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کے تحت قائم ہونے والے اعجاز علمی کے ادارے ''**هيئة الاعجاز العلمى فى القرآن والسنة**'' کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے یمن کے سیاسی و تعلیمی افق پر کئی دہائیوں پر مشتمل ایک سرگرم اور فعال کردار ادا کیا۔ آپ نے یمن کی حزب الاصلاح نامی سیاسی جماعت ۱۹۹۱ء میں قائم کی اور یمن میں جامعۃ الایمان نامی اسلامی یونیورسٹی کے بانی اور صدر بھی تھے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ یمن کی صدارتی مجلس کے ممبر منتخب ہوئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔

شیخ عبدالمجید زندانی کا تعلق یمن سے تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں یمن کے الشعر ڈسٹرکٹ کے الظہی نامی گاؤں میں ہوئی، لیکن ان کے خاندان کی نسبت صنعاء کے محلّہ زندان سے تھی جس کی وجہ سے وہ ''زندانی'' مشہور ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم یمن میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے مصر کا رخ کیا جہاں آپ نے قاہرہ کی عین شمس یونیورسٹی کے شعبہ فارمیسی میں داخلہ لیا لیکن آپ نے دو سال تعلیم جاری رکھنے کے بعد وہاں سے تعلیمی سلسلہ منقطع کرکے جامعۃ الازہر میں شرعی علوم کی تحصیل میں مصروف ہوگئے۔ اس اثناء میں آپ اخوان المسلمین کی تحریک سے متاثر ہوکر اس سے منسلک ہوگئے۔

جس کی وجہ سے آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ پھر آپ نے سوڈان کی ام درمان یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ اس کے بعد آپ یمن واپس ہوگئے، جہاں آپ نے یمن میں اولین جمہوری حکومت کے قیام میں عملی طور پر بھر پور حصہ لیا اور اس کے بعد مختلف حکومتوں میں مختلف عہدوں اور وزارتوں پر فائز رہے۔ اس اثناء میں آپ تعلیمی میدان میں بھی سرگرم عمل رہے اور مختلف تعلیمی درجات کے لئے نصابی کتابیں بھی تیار کیں۔

۱۹۷۸ء میں آپ نے سعودی عرب کا رخ کیا جہاں آپ نے سعودی عرب کے بڑے علماء سے شرعی علوم کی تحصیل کو مزید جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ تعلیم و تدریس سے بھی منسلک ہوگئے او ر جامعات میں محاضرات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہاں آپ نے ۱۹۸۴ء میں بعض سعودی علماء کی معاونت سے قرآن وحدیث کے علمی اعجازات پر تحقیقی کام کے لئے ''**هيئة الاعجاز العلمي في القرآن والسنة**'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے آپ اولین سکریٹری جنرل تھے۔ اس عہدہ پر آپ ۱۹۹۵ء تک فائز رہے۔ اس ادارہ کے تحت عالمی پیمانے پر علماء، اسکالرز اور سائنسدانوں کو مدعو کیا جاتا اور قرآن وحدیث کے مختلف موضوعات کو زیر بحث لاکر اس پر سائنسی تحقیقات پیش کی جاتیں اور قرآن کے علمی اعجازات کو بروئے کار لایا جاتا۔ اس طرح اعجاز علمی کے موضوع کو عالمی حلقوں میں ایک پہچان ملی اور اسے جامعات اور تعلیمی اداروں میں ایک موضوع کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ اعجاز علمی کے موضوع پر شیخ زندانی کی متعدد اہم تصنیفات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک اہم کارنامہ علم جنین Embryology کے ماہر پروفیسر کیتھ ایل مور Keith L. Moore سے ملاقات کرکے جنین کی نشوونما کے سلسلے میں قرآن وحدیث کے بیانات کو اس کے سامنے پیش کرنا اور موصوف کو ان کی حقانیت کا قائل کرانا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف نے علم جنین کے سلسلے میں قرآن وحدیث کے ان بیانات کو اپنی تصنیف کردہ کتاب The Developing Human میں شامل کیا ہے اور اس کتاب کے قرآن وحدیث کی تعلیقات کے ساتھ بین الاقوامی ایڈیشن شائع ہوئے، اور یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ شامل ہیں:

- **تأصيل الاعجاز العلمي**
- **علم الايمان**

- طريق الايمان
- نحو الايمان
- التوحيد
- البينة العلمية فى القرآن الكريم
- انه الحق
- منطقة المصب والحواجز بين البحار
- علم الأجنة فى ضوء القرآن والسنة
- معجزات الرسول و بيناته
- الصفات و منزلقات الفرق
- المرأة و حقوقها السيا سية فى الاسلام

شیخ عبدالمجید زندانی کا ایک اور کارنامہ صنعاء، یمن میں 'جامعۃ الایمان' کے نام سے ایک اسلامی یونیورسٹی کو قائم کرنا ہے جس کے ذریعہ بڑے پیمانے پر ایسے جدید تعلیم یافتہ افراد تیار ہوئے جو جدید علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ شرعی علوم اور خاص طور پر اعجاز قرآن کے ماہر بھی ہوتے تھے۔آپ اس یونیورسٹی کے بانی اور صدر بھی تھے۔اس یونیورسٹی میں جاری سائنسی تحقیقات کے ذریعہ آپ نے ۲۰۰۴ء میں ایچ آئی وی/ ایڈز جیسے موذی اور جان لیوا مرض کا جڑی بوٹیوں کے ذریعہ علاج دریافت کیا، جس سے انہیں عالمی شہرت حاصل ہوئی۔

گزشتہ صدی کی اسی کی دہائی میں آپ نے روس کے خلاف افغان جہاد میں بھی بنفس نفیس حصہ لیا۔آپ سیاسی اعتبار سے اخوان المسلمین کے نظریات کے حامل تھے۔جس کی وجہ سے آپ اکثر امریکی نشانے پر رہا کرتے۔۲۰۱۰ میں امریکہ نے جب یمن میں اپنی فوجیں ارسال کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تو شیخ زندانی نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور امریکہ کے خلاف جہاد شروع کرنے کی دھمکی دی جس کے بعد امریکہ کو اپنا موقف بدلنا پڑا۔۲۰۱۱ء میں یمن کے سیاسی انقلاب میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور انقلابیوں کی کھل کر حمایت کی۔ پھر یمن میں خانہ جنگی شروع ہونے اور ۲۰۱۴ء میں دارالحکومت صنعاء کے حوثیوں کے ہاتھوں سقوط کے بعد شیخ زندانی سعودی عرب منتقل ہو گئے، اور پھر ۲۰۲۰ء میں سعودی عرب سے ترکی منتقل ہو گئے جہاں ۲۲ اپریل ۲۰۲۴ء کو آپ اپنے مالک حقیقی

سے جا ملے۔ آپ کو استنبول کے معروف سیدنا ابو ایوب انصاریؓ کے مقبرے کے احاطہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

شیخ عبدالمجید زندانی سے راقم کی کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ البتہ اعجاز علمی کی متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں ان کے بیٹوں اور جامعۃ الایمان کے متعدد پروفیسروں سے ملاقاتیں ہوتیں جو شیخ زندانی کے پروردہ تھے جن سے شیخ زندانی کے احوال وکوائف اوران کی علمی ودعوتی سرگرمیوں سے برابر واقفیت حاصل ہوتی۔

بہرحال شیخ عبدالمجید زندانی کا انتقال عالم اسلام کے لئے بالعموم اوراعجاز علمی کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بالخصوص ایک بڑا خسارہ ہے۔آپ علم وعمل اور جہاد سے بھری زندگی گزار کراس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ آپ کی مساعی کوقبول فرمائے،انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اوران کے شایان شان اجرعظیم عطا فرمائے۔

باب التقریظ والانتقاد:

رسائل کے خاص نمبر اور نئے جریدے

مہینوں پہلے رسائل و جرائد کے کچھ خاص شماروں کا ذکر ان صفحات میں کیا گیا تھا، ان میں مولانا سید محمد رابع ندویؒ کی شخصیت اور ان کے سوانح پر مشتمل کئی خصوصی اشاعتوں کا تعارف تھا، یہ بھی لکھا گیا تھا کہ بعض اہم رسالوں جیسے تعمیر حیات، الرائد، البعث الاسلامی، دی فریگرنس آف ایسٹ وغیرہ کے خاص نمبروں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔

پندرہ روزہ تعمیر حیات کا ''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ'' نمبر اس لحاظ سے سب پر فائق نکلا کہ اس میں قریب ایک سو چالیس مضامین میں مولانا حسنی ندویؒ کے معاصرین و محبین اور تلامذہ و منتسبین کے ذریعہ مولانا کی زندگی کے ہر گوشہ اور ان کی فکر کی ہر جہت اور خود ان کی شخصیت کی کامل تصویر سامنے آ گئی، یہ خیال محض مبالغہ یا بے قید مداحی نہیں کہ مولانا حسنی ندوی کے ذکر سے جو حقیقت سب سے نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ محبت کی جہانگیری ہے، علم و فضل، اقتدار و رعب، سطوت و شوکت اور علم و جسم کی فرازی و صلابت اور قلم و قرطاس کے ذریعہ جادوگری یہ سب انسان کی کرامت و فضیلت کے پیمانے ہو سکتے ہیں لیکن محبت، خیر خواہی، دلنوازی اور دلداری سے اپنے لیے چاہت کی شمعوں کو کس طرح فروزاں کیا جا سکتا ہے، اس کی جلوہ گری دیکھنا ہو تو ان مضامین کو دیکھا جانا چاہیے۔

الرائد اور البعث الاسلامی میں جہاں **علماً فقد ناه** اور **طاب حیاً و طاب میتاً** جیسی تحریروں میں ایک قابل تقلید شخصیت کا مرقع پیش کیا گیا وہیں ذکریات و خواطر اور شخصیت اور کمالات کے عنوانوں اور اس قسم کی تعبیروں سے **هیهات لا یأتی الزمان** کے مضامین کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

البعث الاسلامی کا افتتاحیہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے قلم سے ہے اور اس کی سرخی ہی سب کچھ کہہ جاتی ہے کہ **وذهب الذین احبهم وبقیت مثل السیف فرداً**، اس شمارہ کی خاص بات ادب اسلامی کے فروغ اور اس کے لیے ہمہ وقت فکرمندی کی تفصیلات ہیں، ''**ابداعاته فی الادب الاسلامی**'' کے تحت ڈاکٹر سعید بن مخاشن، ڈاکٹر محمد یوسف ندوی، استاذ محمد خالد ضیاء ندوی اور ڈاکٹر عبدالوحید شیخ المدنی کے مضامین بڑے کارآمد ہیں۔

انگریزی رسالہ فریگرنس میں پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، اسد مرزا اور پروفیسر ثناء اللہ ندوی کے

مضامین اس شمارہ کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں، جناب شارق علوی، عبدالمجید پاریکھ اور ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تحریریں اس پر مستزاد۔ باقی مولانا بلال عبدالحی حسنی اور مولانا جعفر مسعود حسنی کے مضامین کی اہمیت اپنی جگہ۔

یہ تینوں شمارے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی سرپرستی میں مولانا شمس الحق ندوی، مولانا جعفر مسعود ندوی، مولانا فرمان ندوی اور شارق علوی کی ادارتی سلیقہ مندی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

ان تمام شماروں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تعمیر حیات، الرائد، البعث الاسلامی اور دی فریگرینس آف ایسٹ کی قیمت بالترتیب ۳۰۰، ۱۵۰، ۴۰، اور ۵۰ روپے ہے۔

ششماہی دستک شمارہ ۱۰، حسرتؔ موہانی نمبر، مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، صفحات ۴۰۲، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: شعبہ اردو فیکلٹی آف آرٹس، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی ۳۲۱۰۰۵۔

حسرتؔ موہانی بلکہ مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی کی شخصیت کی یاد اور اس کے ذریعہ مذہب و سیاست وصحافت و شرافت کے بلند ترین اقدار کے احیا کی خواہش اور وہ بھی ہندو یونیورسٹی کے در و دیوار کے سایہ میں، یہ پروفیسر آفاقی کی آفتابی روشنی نہیں تو کیا ہے؟ حسرتؔ نے تو اپنے رنگ تغزل میں ڈوب کر نہ جانے کس عالم میں کہا تھا کہ ع:

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت دل فریبی ترے فسانے کی

حسرتؔ کے فسانہ زندگی کی دلفریبی اس لائق تھی کہ بار بار اس کا ذکر علم وادب اور سیاست وصحافت کی ہر مجلس میں ہوتا، اردو قوم نے فراموش کر دینے اور کرتے رہنے کی جو مثال گذشتہ صدی سے قائم کر رکھی ہے اس نے کتنے ہی نام نیک رفتگان کو ضائع کرنے کا نا قابل معافی جرم اس کی قسمت کا حصہ بنا دیا۔

حسرتؔ موہانی کی یاد محض ایک شاعر، ادیب، صحافی یا راہنما کی بات نہیں، وہ ایک مکمل شائستہ تہذیب، ایک شریف ترین اور شریف ترین زبان کے ادب وشعر کے خوب تر انقلاب کے بانی تھے، با مقصد صحافت کے دور عروج میں انہوں نے خود کو ثابت کیا اور اپنی شناخت کے در و دیوار کو وہ تقدس عطا کیا جس کے ارد گرد شوق کے قدم خود بخود طواف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

تحریک آزادی میں حصہ لینے والے اور بھی تھے لیکن ایمان وتصوف و اشتراکیت کے تضاد و محاذات میں تناسب قائم رکھنے کی ان کی صلاحیت نے ان کو جس طرح کی عظمت عطا کی، گذشتہ صدی

کے ہندوستان کی تاریخ شاید خود بھی حیران ہو، حسرت کو یاد کیا جانا آج بھی کسی فریضہ سے کم نہیں اور یہ فریضہ پروفیسر آفتاب عالم آفاقی نے ایک سے بڑھ کر ایک مضمونوں کو جمع کر کے بلکہ مدفون خزانوں کو نکال کے جس طرح پیش کیا ہے اس کے لیے زبان پر تعریف کے الفاظ ہوں نہ ہوں دل سے دعائیں ضرور نکلتی ہیں، حسرت کی شخصیت، علمی و عملی زندگی، مذہب و مسلک، صحافت و سیاست اور ادب و شعر کے تعلق سے اتنا کارآمد اور اتنا وقیع مجموعہ، ایک نعمت ہے جس کی قدر اور اس کے لیے کلمۂ شکر واجب ہے، سجاد حیدر یلدرم، شیخ ممتاز حسین، مرزا جعفر علی خان اثر، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، اسلوب احمد انصاری، سید احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، معین الدین عقیل اور گوپی چند نارنگ کی نایاب تحریروں سے حسرت کی داستان سنائی گئی، مولانا سید سلیمان ندوی نے حسرت کے مسلک و عقیدے کی بات تو بعد میں کی، ہندوستانی سیاست کے تعلق سے لکھا کہ ۱۹۰۶ء تک مسلمان سیاست سے الگ تھلگ تھے، جسٹس طیب جی اور علامہ شبلی خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے مگر بقول سید صاحب ''بہادر نوجوان حسرت پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں کو سیاست کی تعلیم دی''، یہ جملہ بھی کیا خوب ہے کہ ''بوڑھوں میں صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے جنہوں نے ابتدا ہی میں حسرت کی تائید کی اور ۱۹۰۴ء میں اردوئے معلیٰ کا پہلا سیاسی مضمون پڑھ کر داد دی کہ:

این کہ گفتی حکایت سحر است روز روشن ہنوز در قدر است

سید صاحب سے حسرت نے گاندھی جی کے متعلق کہا کہ '' گاندھی جی جینی فلسفی کی طرح ہر کلام میں دو متضاد پہلو رکھتے ہیں اور بیک وقت دونوں کو حق سمجھتے ہیں''، سید صاحب عموماً مبالغہ سے پرہیز کرتے تھے اس کے باوجود یہ جملہ حسرت کے علاوہ شاید ہی انہوں نے کسی اور کے لیے لکھا ہو کہ ''اس پرفریب عہد میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی''۔

شیخ ممتاز حسین جونپوری کا مضمون بڑا پرلطف ہے، ان کے نزدیک حسرت کے جیسا سچا اور ایماندار نقاد سخن اور صاحب ذوق سلیم کہیں اور دکھائی نہیں دیا۔ ان کا یہ جملہ بھی خوب ہے کہ آج حسرت مرحوم یاد آتے ہیں تو خدا بھی ضرور یاد آتا ہے کہ وہی پیدا کرے تو پھر حسرت جیسے نقاد اور سلیم المذاق شاعر اس دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں، حسرت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رنگ شاعری کے وہ مصلح اور موجد ہیں مگر بقول شیخ جونپوری ''جب کسی نے حسرت کے سامنے اس کا ذکر کیا تو اللہ رے ایمانداری کہ انہوں نے مصلح و موجد ہمیشہ جناب صفی کو قرار دیا''۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری کا کچھ تعارف ضرور آنا

چاہیے تھا کہ وہ گذشتہ صدی کے اصحاب علم وفضل میں کس شان کے حامل تھے۔

محدود صفحات میں اس خاص شمارہ کی غیر محدود خصوصیات کا شمار ممکن نہیں، لیکن پروفیسر آفاقی اور ان کے رفقا کی محنت کی داد بہر حال ممکن ہے، کاش حسرت موہانی کو جاننے کی حسرت اردو والوں میں پیدا ہو جائے، اگر یہ ہوا تو یہ خصوصی شمارہ سب سے آگے اپنی قرأت کی دعوت دینے کا بجا طور پر مستحق ہوگا۔

دستک کا ایک اور خصوصی شمارہ فراق گورکھپوری نمبر ہے، اس کا اور وحشی سعید کے رسالہ نگینہ کا سالنامہ، ششماہی مجلہ شیخ العالم ردولی شریف کا خواجہ غریب نواز نمبر، نیا دور لکھنؤ کا افسانوی ادب نمبر، النادی العربی کا المعاجم العربیہ نمبر اور جموں سے فاروق مضطر کا نیا رسالہ دھنک اور فکر اقبال کا ترجمان نئی دہلی کا میرا پیام نمبر ابھی بھی تعارف کے منتظر ہیں، ان میں اردو ادب کا املا نامہ نمبر بھی ہے۔

ماہنامہ راہ اعتدال، خصوصی اشاعت، اسلام اور غیر مسلم، مدیر مسئول مولانا محمد رفیع کلوروی عمری، صفحات ۲۱۰، قیمت ۷۰/روپے، پتہ: راہ اعتدال، دارالسلام، عمر آباد، تامل ناڈو ۶۳۵۸۰۸ موبائل نمبر: ۹۳۴۲۸۰۱۹۰۰

جنوب ہند کی مشہور درس گاہ دارالسلام عمر آباد جس طرح اپنی تعلیم و تدریس و ترتیب کے لیے مشہور ہے، اسی طرح دعوت وتبلیغ خصوصاً غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا فریضہ بھی اس کی نمایاں شناخت بن چکا ہے، ساتھ ہی یہ احساس بھی وہاں عام رہا کہ غیر مسلم برادران وطن سے اصل رشتہ داعی اور مدعو کا ہے حاکم ومحکوم کا نہیں، اسی فکر کو عام کرنے کی غرض سے ادارہ کے علمی واصلاحی ترجمان راہ اعتدال نے زیر نظر اشاعت خاص کردی، اداریہ میں واضح کردیا گیا کہ موجودہ دور ہندو مسلم تعلقات کے لحاظ سے بڑے نازک وقت سے گزر رہا ہے، غلط فہمیاں بڑھتی جاتی ہیں، وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کو اس کے اصل سرچشموں سے دور ہوکر مسلمانوں کی موجودہ زندگی اور اخلاقی سطح سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کی صحیح پہچان اس کی اصل تعلیمات، دعوت دین کی اہمیت، دلت سماج اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہندوستانی دستور وغیرہ موضوعات پر بڑی مفید تحریروں نے اس اشاعت کی خصوصیت واضح کردی ہے، موجود معاشرہ میں ابوطالب کی تلاش یہ عنوان ہی بڑا دلکش ہے۔ نامور اہل قلم کی تحریروں نے اس شمارہ کو واقعی مطالعہ اور تجزیہ کے لائق بنادیا ہے۔ (ع۔ص)

تبصرۂ کتب

مولانا محمد فرمان ندوی، **علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تفسیری نکات**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۹۲، قیمت ۴۵۰ روپے، باراول ۲۰۲۲ء، پتہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ لکھنؤ، فون نمبر ۲۷۴۱۵۳۹-۰۵۲۲، ای میل: info@airp.org.in

زیرنظر کتاب کا جب پہلا حصہ شائع ہوا تو پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی مرحوم نے اس کو مولانا ''سید سلیمان ندویؒ کی قرآن فہمی کا دستاویزی ثبوت'' کے الفاظ سے تعبیر کیا اور اس کوشش کو طالبان علوم قرآن پر احسان بتایا، درحقیقت علوم سلیمانی پر گہری نظر رکھنے والوں کا تو یہ اعتراف رہا کہ سید صاحب نے نزول قرآن کے زمانہ کے لوگوں کے احساسات ونفسیات کو بہتر طریقہ سے سمجھا، یہ بھی کہا گیا کہ فہم قرآن میں برصغیر میں ان جیسا کوئی نہیں ملا جس کا مطالعہ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو، اس کے باوجود سید صاحب کی علمی وادبی وتاریخی فتوحات میں ان کے قرآنی بیانات وتشریحات پر توجہ کم ہی کی گئی، سیرت النبیؐ، سیرت عائشہؓ، ارض القرآن، مقالات سلیمان حتی کہ شذرات معارف میں جگہ جگہ ہر روش پر قرآنی مطالعہ اور اس کے نتیجے میں فہم قرآن کی خدا جانے کتنی شمعیں روشن ہیں، جن کی کرنوں کو سمیٹنے کی ضرورت ہمیشہ رہی، سید صاحب کے ہاتھوں میں جو نسخہ قرآن تلاوت کے لیے ہمیشہ رہا اس میں جابجا سید صاحب کے قلم سے ضروری حواشی نظر آتے ہیں، فاضل مرتب کو ان حواشی کی ترتیب کا داعیہ پیدا ہوا جو ان کے ذوق وشوق کی بدولت سید صاحب کی ہر تحریر میں شامل قرآنی بیانات کو جمع کرنے میں معاون بن گیا، یہ دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی غیر معمولی محنت کی متقاضی تھی لیکن جیسا کہ پہلے حصہ پر تبصرے میں یہ الفاظ قلم کی زبان سے نکلے تھے وہی آج بھی نوک قلم پر ہیں کہ ''فاضل مرتب اس امتحان میں سرخرو ہوکر نکلے''، زیرنظر دوسرے حصہ میں عقائد وایمانیات، عبادات ظاہری وباطنی، اخلاقیات، حقوق، فضائل ورذائل، آداب ومعاملات، اصلاح دعوت، حواشی قرآنی، قرآن کے آئینہ میں سیرت نبویؐ، معجزات نبویؐ، دعوت نبویؐ، ہجرت اور پیشین گوئیاں اور غزوات جیسے عنوانوں کے تحت قرآنی آیات کی سلیمانی تشریح کا شہد اور عطر کشید کرلیا گیا اور بقول مولانا سعید الرحمٰن اعظمی یہ مجموعہ بجائے خود مستقل تفسیر کا درجہ رکھنے والا بن گیا ہے۔ **(عمیر الصدیق ندوی)**

عقیل احمد ضیاء، عمران علی آبادی، **رہبر تابانی قلم کاروں کی نظر میں**، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۹۶، قیمت: ۳۰۰/روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، پتہ: مدرسہ معین الاسلام، دریاباد، بارہ بنکی، موبائل نمبر: ۹۹۳۵۷۹۰۶۲

رہبر تابانی مرحوم مشاعروں سے زیادہ شاعروں میں مقبول تھے، موجودہ دور میں فن شعر گوئی میں قدیم اساتذہ شعراء کی روایت بہت سی پاکیزہ روایتوں کی طرح معدوم ہوتی جاتی ہے۔ ایسے میں افقر موہانی، شفیق جونپوری، تاباں شفیقی کے اس سلسلہ کے شعری امتیازات کی حفاظت و پاسداری کی ذمہ داری کو احسن طریقہ سے انجام دینا جس کا سرا حسرت وتسلیم ونسیم سے ہوتے ہوئے مومن خاں مومن سے جاملتا ہے، بجائے خود عظمت واہمیت کی دلیل ہے۔ رہبر تابانی نے جس طرح استاذ سخن کی مسند کو وقار بخشا اور خاکسارانہ وضع داری نبھا کر اور تشہیر کی رسوائی سے محفوظ ہو کر اردو زبان اور اس سے بھی زیادہ علم عروض کی مسلسل خدمت کی اور سب سے بڑھ کر سادہ، گہرے اور صالح خیالات سے شاعری کو قابل احترام بلکہ تقدس کا درجہ عطا کیا، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں، رہبر تابانی مرحوم عمرہ کی سعادت سے سرفراز ہو کر واپس آئے اور چند ہی دنوں بعد جس کے گھر کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے اسی کے حضور پہنچ گئے، ان کی وفات کے بعد جس طرح ان کا ماتم ہوا تب اندازہ ہوا کہ خاموش محنت اور خدمت کی قدر ومنزلت کچھ اور ہی شے ہے، اس کتاب میں جہاں تاباں شفیقی، خمار بارہ بنکوی، عزیز بارہ بنکوی، شمیم حیدر ردولوی، واصف فاروقی، آذر بارہ بنکوی جیسی نامور ہستیوں کے افکار وخیالات وتاثرات سے رہبر کے کلام اور اس سے بھی زیادہ ان کی پاک صاف اور شفاف شخصیت کا تعارف ہوتا ہے، وہیں تسنیم فاروقی، طارق ایوبی، ڈاکٹر انور حسین، امیر حمزہ اعظمی، مخمور کاکوروی جیسے سرزمین اودھ کی ادبی اور علمی عظمتوں کے امین اہل قلم کی تحریریں رہبر کی یادوں کو لازوال بنادیتی ہیں۔ مرتبین نوخیز ہیں لیکن سلیقہ میں کم نہیں۔ اودھ کے قصبات کی فضاؤں میں آج بھی وہی رنگ ہے جس نے کبھی دبستان لکھنؤ کو اس کی اصل پہچان دی تھی، ساتھ ہی ادبی وضع داری کے ساتھ اس بانکپن کا امتیاز بھی عطا کیا تھا جس نے لکھنؤ کو تہذیب وتمدن کی مملکت کا عروس البلاد بنادیا۔ یہ کتاب محض ایک استاذ الشعراء ہی نہیں ایک نہایت دلکش خطہ ارض کی تصویر بھی ہے۔

محمد امان الرحمٰن، محمد منیب الرحمٰن (مترجم)، **پرافٹ آف دی ورلڈ**، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۴۸۰۔ المعہد العالی الاسلامی تعلیم آباد قبا کالونی، شاہین نگر حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۵، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء،

قیمت درج نہیں۔موبائل نمبر و ای میل: درج نہیں۔

مشہور عالم دین اور صدر مسلم پرسنل بورڈ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے لاک ڈاؤن کے دوران ''پیغمبرؐ عالم'' کے نام سے جو کتاب ۲۰۲۰ء میں تصنیف کی تھی زیر تبصرہ کتاب اسی کا آسان انگریزی ترجمہ ہے۔سیرت رسول پر بے شمار کتابیں دستیاب ہیں۔اس کتاب کے پیچھے کا اصل محرک موجودہ سیرت لٹریچر کو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں مفید و قابل رسائی بنانا ہے۔رسول اللہؐ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔آپؐ کی ہستی پوری انسانیت کے لیے لائق تقلید اور اسوہ ہے۔مولانا نے اسی احساس کے تحت موجودہ ذہن کی رعایت کرتے ہوئے آپؐ کے پیغام، حالات زندگی ،اخلاق و عادات جیسے پانچ ابواب کے تحت ایک نیا گلدستۂ سیرت تیار کر دیا ہے۔

کتاب میں آپؐ اور صحابۂ کرامؓ کی مکی زندگی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ اور صحابہ مظلوم تھے ظالم نہیں۔کتاب اس کوشش میں کامیاب ہے کہ عہد حاضر کے مسائل کو حل کرنے میں سیرت رسولؐ کس طرح مدد و معاون اور رہنما ہو سکتی ہے؟۔خطبۂ حجۃ الوداع کے تجزیے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی وضاحت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ حقوق انسانی کا پہلا منشور ہے۔مزید افادیت کے لیے دوسرے مذاہب کی نمائندہ کتابوں میں آپؐ کے متعلق پیشین گوئیوں کا بیان بھی ہے۔اس کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے بعض ممتاز دانشوروں اور شاعروں نے حضورؐ کی شان میں جس عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔انگریزی میں ترجمہ کرنے والے قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے سیرت کے تعلق سے ایک عمدہ خدمت کی ہے۔ **(کلیم صفات اصلاحی)**

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، **رسول اللہؐ شعب ابی طالب میں**، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۱۶، ملنے کا پتہ :ھدیٰ پبلیشنگ ہاؤس ڈی ۱۱۰، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔موبائل نمبر: ۹۹۱۰۷۰۲۶۷۳۔

آنحضورؐ کی حیات طیبہ کا ایک اہم واقعہ شعب ابی طالب میں محصوری ہے۔اس الم ناک و دردانگیز معاشرتی و معاشی مقاطعہ کا تین برس تک مسلسل مقابلہ جس پامردی و ثابت قدمی سے آپؐ اور آپؐ کے اہل خاندان نے کیا پوری انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔عزم و استقلال کا یہ اسوۂ مکی مشکل ترین حالات میں دین پر عمل کے لیے عام مسلمانوں کو ہمیشہ حوصلہ دے گا۔

شعب ابی طالب کی اصل حقیقت،محل وقوع،قدیم وجدید تاریخ،مقاطعہ کے آغاز،اس کے اسباب،دستاویزات،مقاطعہ کے فریق،محصورین کی تعداد،شعب کے اندر رسول اللہؐ کی حفاظت کا طریقہ،ابو طالب کی حکمت عملی،ابولہب اور اس کے بیٹوں کا کردار،ایام مقاطعہ کے احوال،آنحضورؐ کی حکمت عملی،دعوتی کام،ہجرت حبشہ ثانیہ،شاہ نجاشی سے مراسلت،مظلوم مسلمانوں کے لیے دعا کا اہتمام،دوران مقاطعہ نزول قرآن وآیات وغیرہ کی تفصیلات اس کتاب میں دوسری کتابوں سے زیادہ پیش کردی گئی ہیں۔مصنف نے اس دورابتلا کا جائزہ وتجزیہ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ایام محاصرہ کی بہت ساری وہ سرگرمیاں جو عام کیا خاص طبقہ کو بھی معلوم نہ ہوں گی اس کتاب میں یک جا مل جائیں گی۔وفد حبشہ،حضرت ابوبکرؓ کی ہجرت پھر ابن الدغنہ کی کوشش سے ان کی واپسی اور مسجد کی تعمیر،غلبۂ روم کی بشارت،حضرت ابوسلمہؓ اور عثمان بن مظعونؓ کو ابوطالب کے جوار دینے کے مشہور واقعات کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ یہ اسی دوران مقاطعہ کی یادگا ہیں۔

مصنف نے روایتوں پر ناقدانہ نگاہ ڈال کر تبصرہ بھی کیا ہے۔آخر میں ابوطالب کے قصیدۂ لامیہ،بائیہ اور دالیہ کے ان اشعار پر گفتگو کی گئی ہے جن پر ابن ہشام اور ابن کثیر نے مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ان قصیدوں میں اس دور کے حالات اور ان سے نبرد آزما ہونے کی ابوطالب کی حکمت عملی اور رسول اللہؐ کی تعریف وتوصیف کا ذکر ہے۔مصنف نے اس سے بجاطور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''اس طرح جناب ابوطالب نعت گوئی میں پیشوائی کا مقام رکھتے ہیں''۔کتاب اپنی جامعیت وافادیت کے سبب شائقین کتب سیرت میں مقبول ہوگی۔ **(ک۔ص اصلاحی)**

رفیع احمد بن عاقل، **مولانا عبدالسلام مدنیؒ حیات وخدمات**،کاغذ وطباعت عمدہ،مجلد،صفحات ۲۲۴، ملنے کا پتہ: مکتبہ الفہیم،مئوناتھ بھنجن،یوپی،موبائل نمبر:۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴،دارالکتب الاسلامیہ،اردو بازار،جامع مسجد،دہلی،۹۹۱۰۸۸۹۳۵۷،سن اشاعت:۲۰۲۳ء،قیمت ۳۸۰ روپے۔

مولانا عبدالسلام مدنی نیک نام عالم تھے۔ان کا وطن سدھارتھ نگر کا ایک گاؤں تھا۔لیکن ان کی علمی،تعلیمی وعملی زندگی کا تعلق جامعہ رحمانیہ،بنارس اور اس کے اطراف سے رہا ہے۔انہوں نے وفاق المدارس اور جامعہ سلفیہ کے ابنائے قدیم کی تنظیم بھی کی۔حق گوئی،خیر خواہی،محنت اور خود اعتمادی کی خوبیوں سے متصف تھے۔ایک خوبی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اختلاف کے باوجود وہ دوسروں کے دلائل سنتے تھے۔درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا ذوق تھا۔افتا کی ذمہ داری بھی انجام دیتے تھے۔مشکوٰۃ المصابیح،سنن نسائی وغیرہ پر ان کی تعلیقات چھپ چکی ہیں،صحیح مسلم کے علاوہ اور بعض اہم عربی ادب کی

درسی کتابوں اور لغات پر بھی ان کی تصحیحات وتعلیقات ہیں جو ابھی چھپے نہیں ہیں۔

مولانا کے سوانح کے ضمن میں مرکزی دار العلوم جامعہ سلفیہ (بنارس) اور جامعہ رحمانیہ کی تاریخ بھی اس کتاب کی اضافی خوبی ہے۔عقیدت ہے لیکن محققانہ اور تجزیاتی رنگ غالب ہے۔ **(ک،ص اصلاحی)**

ابوعبداللہ عنایت اللہ بن حفیظ اللہ سنابلی مدنی، **بھینس کی قربانی۔ایک علمی وتحقیقی جائزہ**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، غیر مجلد، صفحات ۲۸۰، قیمت درج نہیں، سالِ اشاعت ۲۰۱۹ء، پتہ: شعبۂ نشر واشاعت صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی، ٹیلی فون: ۰۲۲۔۷۷۔۲۰۰۷۵۶۵۲

زیر تبصرہ کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔اس کتاب کا مرکزی موضوع بھینس کی قربانی کا جواز ہے۔آخری فصل میں عدم جواز کے بھی بعض استدلالات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے موضوع پر اتنی تفصیلی گفتگو کی نوبت ہی کیوں پیش آئی؟ جب کہ محققین علماء بھینس کو گائے پر قیاس کرکے اس کے جواز کا فتویٰ بہت پہلے دے چکے ہیں۔اور اسی پر صدیوں سے تعامل بھی رہا ہے۔مثلاً: مقتدر علمائے اسلام میں امام سفیان ثوری، امام مالک اور امام ابن مہدی وغیرہ رحمھم اللہ خود اس بات کے قائل ہیں کہ: ان الجوامیس من البقر ، بلاشبہ بھینسیں گائے ہی کی جنس سے ہیں۔(۱۴۳)

اس سلسلے میں شیخ عثیمین ؒ کا جمہور فقہا کی ترجمانی میں ایک قول ہے کہ بھینس گائے ہی کی ایک قسم ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف ان مویشیوں کو بیان کیا ہے، جو عربوں کے یہاں معروف تھے، جنہیں وہ اپنی خواہش کے مطابق کبھی حرام اور کبھی جائز کر لیتے تھے، جب کہ بھینس اصلاً اہل عرب کے یہاں معروف نہ تھی۔(۱۷۶)

اکابر علما کی رائے بالکل واضح ہے جو ماننے والوں کے لیے کافی وشافی ہے۔اس کے بعد مزید تشریح کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی اور نہ ہی شریعت اسلامی کا مزاج اس طرح کی موشگافیوں سے میل کھاتا ہے۔

تیسرے ایڈیشن کے مقدمہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مہاراشٹر جیسے صوبے میں گائے اور اس کی نسل کے ذبیحہ پر جب چند سال قبل پابندی عائد کی گئی تو عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ کاروباری مشکلات سے دوچار تو ہوا ہی مسلمانوں میں بھی قربانی اور ذبیحوں کے سلسلے میں الجھن سامنے آئی۔بھینس کی قربانی کے جواز وعدم جواز کی بحث سے کثرت سے سوالات اٹھنے لگے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بطیب خاطر نہیں بلکہ باکراہ ہندوستان میں ایک طبقہ نے بھینس کی قربانی کے جواز کا فتویٰ صادر کیا۔ **(فضل الرحمٰن اصلاحی)**

محمد طارق غازیؔ
وِھٹبی، کینیڈا

حیف دیوار وطن کو بام سمجھے ہے حریف
قومیت کی قید کو اکرام سمجھے ہے حریف

شعرِ غالب کا وہی زنگار طوطی رنگ ہے
اب بھی دل کے زنگ کو اسلام سمجھے ہے حریف

دور آزادی میں میرا فکر بھی مشکوک ہے
اک فغانِ درد کو دشنام سمجھے ہے حریف

اپنی محرومی میں کل شب بک رہا تھا جانے کیا
میرے ہذیاں کو مگر الزام سمجھے ہے حریف

صبح گاہی آہ اک آواز میں کیا ڈھل گئی
خوف کا مارا اسے کہرام سمجھے ہے حریف

متحد ہیں سب لٹیرے آج تک تیرے خلاف
شاہ بھی ہو تو اسے بہرام سمجھے ہے حریف

بے خبر ہوں میں الف با سے، ولیکن جب اٹھوں
ابتدا ہوتی نہیں انجام سمجھے ہے حریف

ہر خفی نسبت پہ بھنا اٹھتا ہے محروم عقل
چادرا کو جامۂ احرام سمجھے ہے حریف

میں اٹھوں تو اک قدم ہوتا ہے صدیوں پر محیط
اور مری پسپائی کو دوگام سمجھے ہے حریف

معارف کی ڈاک

مراسلات

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر معارف کے قیمتی صفحات میں اپنی آشفتہ بیانی اور ژولیدہ لسانی کے اشاعت پذیر ہونے کے تعلق سے آپ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔ اسی بابت عرض ہے کہ میں بسا اوقات اپنے مراسلے کے بعض محذوف مندرجات اور تبدیل شدہ محتویات کے ساتھ شائع شدہ دیکھ کر ذہنی اذیت، دماغی کوفت اور خلجانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں۔ اس لئے میری آپ سے یہ درخواست ہوگی کہ مراسلہ نگار کے مراسلے کے مشتملات کو کتر بیونت نہ کیا جائے بلکہ اسے من وعن شائع کیا جائے تاکہ ان کا منشا خبط نہ ہونے پائے، البتہ مراسلہ نگار کے قلمی تسامحات اور فکری زلالات کی نشان دہی کے لئے حاشیائی سطور قلم بند کئے جائیں جس سے ان کی اصلاح بھی ہو جائے گی اور رسالے کا اپنا ابلاغ بھی ہو جائے گا۔ اس معاملے میں جناب پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی رحمۃ اللہ علیہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا کانفرنس گزٹ اس کی درخشاں مثال تھا۔

مراسلے کے طویل ہونے کی صورت میں ان کی اشاعت میں تاخیر کی گنجائش سے انکار ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ کسی بھی رسالے کے مدیر کا مسلم ادارتی حق، تمکنت اور موقف ہے۔ کیوں کہ اسے زیر ترتیب دے کر منتخبہ نگارشات و کاوشات کو بھی اشاعت کے عمل میں لانا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک قابل توجہ اور لائق التفات امر یہ ہے کہ معارف کے سرورق پر 'مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ' لکھا ہوا دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ لفظ ''دارالمصنّفین'' کی اشتقاقی صورت اور معنوی پہلو پر غور کرنے کے بعد اس سے پہلے 'مجلس' کا اضافہ مجھ جیسے کم سواد اور ہیچ مداں کی سمجھ سے ماوراء اور فہم سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس بابت بھی رہنمائی کی درخواست ہے تاکہ میں اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی لا سکوں اور صحیح امر سے واقف ہو سکوں۔

راجو خان

۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

معارف: شکریہ۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہر وقت کتنے مضامین اشاعت کے منتظر رہتے ہیں

بلکہ ان کا نمبر ہی نہیں آتا ہے۔اس لئے طویل خطوط کی اشاعت ممکن نہیں ہے۔ براہ کرم مختصر خطوط ارسال فرمائیں تاکہ آپ کو شکایت نہ ہو۔

''وفات شبلی پر قطعہ تاریخ اور لوح مزار: ایک مطالعہ''

مندرجہ بالاعنوان سے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کا ایک طویل مضمون، معارف، شمارہ مئی ۲۰۲۴ء،صفحات ۲۶-۵۰ میں شائع ہوا ہے۔عنوان ''وفات شبلی پر قطعات تاریخ اور الواح مزار: ایک مطالعہ'' ہوتا تو بہتر تھا کیوں کہ اس میں ایک قطعہ یا لوح نہیں، کئی قطعات اور الواح زیر بحث آئے ہیں۔مضمون جس قدر طویل ہے اسی قدر اس میں غلطیاں بھی ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے یہ مضمون لکھنے میں کسی قدر تساہل سے کام لیا ہے اور شاید معارف کے مرتبین نے بھی چھاپنے سے پہلے اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور جوں کا توں چھاپ دیا ہے۔اگر اشاعت سے قبل کسی نے اسے پڑھا ہوتا تو اس میں کم از کم تکنیکی اور فنی غلطیاں نہ ہوتیں۔راقم السطور کو اس میں جو کلی اشکالات نظر آئے ، وہ یہ ہیں:

الف: مصرعوں میں درآئے مادّہ ہائے تاریخ کو واضح نہیں کیا گیا (سوائے دو تین مقامات پر)۔ بہتر ہوتا مادّہ ہائے تاریخ واوین میں درج کیے جاتے یا ان کے نیچے لکیر کھینچ دی جاتی یا قدرے نمایاں کتابت کیے جاتے۔

ب: جو مادّہ ہائے تاریخ تعمیہ یا تخرجہ والے ہیں، ان کو بھی واضح نہیں کیا گیا، سوائے ایک دو کے۔

ج: مضمون نگار نے شاید خود مادّہ ہائے تاریخ کو حساب جمل سے استخراج کر کے اطمینان نہیں کیا، کیوں کہ بہت سے مادّے شبلی کی تاریخ وفات سے مطابقت نہیں رکھتے۔

د: ایسا لگتا ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں شبلی کا سال وفات ۱۳۳۲ ہجری/۱۹۱۴عیسوی/ ۱۳۲۲ فصلی اس قدر راسخ تھا کہ انھوں نے بلا تامل اکثر مادّوں کے نیچے یہ تاریخیں لکھ دی ہیں جب کہ مادّہ ہائے تاریخ کی ان تاریخوں سے مطابقت نہیں ہے۔

ہ: کئی فارسی اشعار غلط نقل ہوئے ہیں۔

و: مضمون میں کچھ قطعات ایسے ہیں جو مختلف شاعروں سے منسوب ہوکر چھپ گئے ہیں۔اس

تعدّد انتساب کی وجہ معلوم نہیں!

یہاں ان سب اشکالات کے چند شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔ راقم السطور نے فارسی قطعات کو زیادہ توجہ سے پڑھا ہے اور اردو قطعات سے صرف نظر کیا ہے۔

ص ۲۶: ''خان وماں شکیب پاک برفت''، اسے خان ومان لکھنا چاہیے۔

ص ۲۶: ''از سر وصل اوتوان بگذشت/ گر چہ این حرف خود نیارم گفت ۱۸۸۳ء، ۱۸۸۹ء''

وانگہ سال مرگ او گفتم/ کا فتابی بزیر خاک نہفت ۱۸۸۳ء، ۱۸۸۹ء''

یہ دونوں اشعار اسی طرح درج ہوئے ہیں، قاری کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ یہاں ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۹ء کا کیا مطلب ہے اور اس میں اصل مادّہ کیا ہے اور تاریخ کون سی ہے؟ دراصل ''کا فتابی بزیر خاک نہفت = ۱۸۸۹ء'' مادّہ ہے اور ''سر وصل'' کی واو = ٦ کے عدد اس سے کم کرنے ہیں، تب اصل تاریخ ۱۸۸۳ء حاصل ہوتی ہے۔ مضمون نگار نے ان قطعات کے لیے مکاتیب شبلی اول ص ۶۴-۶۵ کا حوالہ دیا ہے۔ میرے سامنے مکاتیب شبلی مطبوعہ مطبع شاہی لکھنو ہے اور مضمون نگار کے سامنے بھی غالباً یہی ایڈیشن تھا، اس میں یہ قطعہ ص ۶۱ پر درج ہوا ہے اور وہاں حاشیے میں وضاحت کے ساتھ عمل تخرجہ دیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے اس حاشیے کو آگے جا کر ص ۲۷ پر نقل کیا ہے۔ اگر اس قطعے سے متصل نقل کرتے تو بات واضح ہوتی۔

ص ۲۶: ''مرحبا مرحبا لمولودٗ''، لمولود کو تنوین کے ساتھ لمولودٍ لکھا جانا چاہیے؛ ''یاز در پیشگاہ بزم وجودٗ'' یاز کی جگہ باز ہونا چاہیے۔ ''گفت شبلی: بہار باغ کمال'' اس میں اگر مادّہ تاریخ 'بہار باغ کمال' ہے تو اس کے ۱۳۰۲ عدد بنتے ہیں، لیکن مضمون نگار نے ۱۳۲۰ لکھا ہے شاید صفر اور دو کا مقام ادل بدل ہو گیا ہے۔ مکاتیب شبلی، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، وہاں ۱۳۰۲ ہی ہے۔

ص ۳۱: ''ہر ایک از اہل سخن می نالد''، یہاں ہر یک ہونا چاہیے۔

ص ۳۲: مولوی احسن اللہ خان ثاقب کا جہاں دوسرا مسدس ختم ہوا ہے وہاں اختتام پر ۱۹۱۴ لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس مادّے کے اعداد ہیں؟

ص ۳۲: یہ جملہ لکھا ہے: ''حاشیہ میں ایک اور مصرعہ [کذا: مصرع] تاریخ ہے جو ہے تو فارسی میں

اور اس پر رمز بھی فارسی کا ہے‘‘۔اس کے بعد جو مادّہ درج ہوا ہے اس کے ساتھ ف۱۳۲۲لکھا ہے۔ بلکہ اس سے پہلے جو مادّہ درج ہوا ہے اس کے ساتھ ف۱۳۲۴لکھا ہے حالانکہ یہاں بھی ف۱۳۲۲ہونا چاہیے۔فاضل مضمون نگار نے جس رمز (ف) کو فارسی بتایا ہے وہ دراصل فصلی سال کی طرف اشارہ ہے۔

ص۳۳: ’’بگو شبلی نعمانی‘‘ کے نیچے خط کھینچ کر اسے مادّہ ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ اس میں لفظ ’بگو‘ مادّے کا حصّہ نہیں ہے۔

ص۳۵: دلگیر اکبر آبادی کا جو قطعہ نقل ہوا ہے وہ تعمیہ اور تخرجہ کے ساتھ ہے، لیکن مضمون نگار نے کوئی وضاحت نہیں کی۔

ص۳۷: بست وہست کو بست وہشت لکھنا چاہیے۔

ص۳۷: سفیر کے قطعہ کے مقطع میں مصرع ’’از جہانے گوئی شبلی نعمانی گذشت‘‘ کے نیچے اس طرح عدد دیے گئے ہیں: ۶۹......۱۹۱۴، اس سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ تعمیہ یا تخرجہ کی کوئی صورت ہے تو اس کی الگ سے وضاحت ہونی چاہیے تھی۔

ص۳۸: عارج کے ایک مصرع کو یوں لکھا گیا ہے: ’’مصرع سال وصالش عارج غم گین بنشت‘‘، بنشت کی جگہ نبشت ہونا چاہیے۔

ص۳۹: مضمون نگار کا یہ جملہ غیر فصیح ہے: ’’ایک اور مادّہ تاریخ مولوی عبدالرحمٰن نے درج ذیل فقرہ سے مستنبط کیا ہے‘‘، یوں ہوتا تو بہتر تھا کہ ایک اور تاریخ مندرجہ ذیل مادّہ سے مستنبط کی ہے یا نکالی ہے۔اس کے بعد مادّہ ’’آفتاب زیر خاک‘‘ لکھ کر اس کے نیچے۱۳۳۲لکھا ہے، حالانکہ اس مادّہ کے ۱۳۲۲عدد بنتے ہیں۔اس کے نیچے مولانا ظفر علی خان کا ایک تبصرہ نقل ہوا ہے کہ اس مادّہ میں لفظ اللہ کے ۳۶عدد لیے گئے ہیں......الخ، لیکن منقولہ مادّہ ’’آفتاب زیر خاک‘‘ میں تو لفظ اللہ نہیں ہے! غالبًا یہ تبصرہ ناطق کلانوری کے مادّہ ’’مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مرقدہٗ‘‘ کے بارے میں ہے جو مضمون کے ص۴۷ پر درج ہوا ہے۔اسے وہیں درج ہونا چاہیے تھا۔

ص۳۱، ص۳۹، ص۴۰ پر ایک ہی قطعہ (آہ سردفتر ارباب کمال) تین مختلف شاعروں سے منسوب

ہوکر نقل ہوا ہے۔ پہلے احسن اللہ خان ثاقب سے اور پھر عزیز الدین عزیز لکھنوی اور آخر میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے۔ص ۴۰ پر مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے کلام کے طور پر ایک اور مسدس درج ہوا ہے جو پہلے ص ۳۱ پر احسن اللہ ثاقب کے کلام کے طور پر درج ہو چکا تھا۔

ص ۴۱-۴۲: علی زینبی کا جو فارسی قطعہ درج ہوا ہے اس میں چند مصرعے بے وزن ہیں یا ان میں کتابت کی غلطیاں ہیں، جیسے: ندانیم کو ندانیم ہونا چاہیے؛ جذبہ داشت کو جذبہ ای داشت ہونا چاہیے؛ ''درو دیوار جزواوز بے جانی ما'' مہمل مصرع ہے؛ ''چہ تو آں گفت زبود'' میں تو ان ہونا چاہیے، زبود کا کچھ مطلب نہیں ہے؛ ''بعد از ان زجلہ دیدیم'' کا بھی کوئی مفہوم نہیں ہے؛ اس قطعے میں '' بگو رفت'' کے نیچے خط کھینچ کر عدد ۱۳۳۲ لکھا گیا ہے، حالانکہ مادّہ ''رفت زما شبلی نعمانی ما'' ہے۔

ص ۴۲-۴۳: قیم لائل پوری کے قطعے کو بہت متاثر کن قرار دیا ہے، حالانکہ یہ جس طرح نقل اور درج ہوا ہے وہ اغلاط سے پُر اور ہر مصرع خارج از وزن ہے۔''زفکر سال وصلش چون شدم غروب حیرانی؛ نگوش ہوش من آمد ندا راز مطلب حمانی؛ زنار بخش شومی آگاہ انتہا گیر ہمین خوانی''؛ ان مصرعوں میں کتابت کی کچھ غلطیاں تو سامنے کی ہیں جیسے بگوش ہوش کو نگوش ہوش لکھا ہے، زتار تخش شوی کو زنار بخش شومی لکھا ہے لیکن باقی مصرعوں کا کیا کیا جائے؟

ص ۴۴: حکیم لطیف احمد کے کہے ہوئے مادّہ ''مولوی شبلی بہشت مقام'' کے نیچے عدد ۱۳۳۲ف لکھا ہے جب کہ یہ ۱۳۲۲ف [فصلی] ہونا چاہیے۔ان کے دوسرے مادّہ ''ہوئی ان کے قدموں سے جنت کو زینت'' کے نیچے بھی ۱۳۲۲ف لکھا ہے جب کہ میرے حساب سے ۱۳۱۸ عدد بنتے ہیں۔ میں نے ''ہوئی'' کے ۲۱ عدد شمار کیے ہیں۔

ص ۴۵: حکیم لطیف احمد کے ایک اور مصرع ''یہ شبلی نہ تھا، شبلی عصر تھا'' کے نیچے ۱۹۱۴ لکھا ہے، معلوم نہیں کیسے؟ ان کے ایک دوسرے مصرع ''مدفن شبلی بہشت محل'' کو ۱۳۳۲ کے برابر بتایا ہے جب کہ اس مادّہ سے ۱۳۰۱ برآمد ہوتا ہے۔ان کے ایک اور مصرع ''کہ شد شبلی سوئے جناں'' کے نیچے بھی ۱۳۳۲ لکھا ہے۔ یہ مصرع ناقص اور خارج از وزن ہے اور موجودہ صورت میں اس کے اعداد ۱۸۵ بنتے ہیں۔

ص ۴۷: ناطق کلانوری کے مادّہ ''مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مرقدہ'' کے اعداد ۱۳۳۲ھ لکھے گئے ہیں

جب کہ اس کے عدد ۱۳۶۲ بنتے ہیں، اس پر مولانا ظفر علی خان کا تبصرہ پہلے گذر چکا ہے۔

ص ۴۸: میر نثار حسین نثار کے مصرع ''آن فاضل اجل چون خرمیدہ ......''؛ خرامیدہ ہونا چاہیے۔ اس کے دوسرے مصرع میں 'نالہ فغاں' کی جگہ نالہ وفغاں ہونا چاہیے۔ 'زین واعہ' کو زین واقعہ ہونا چاہیے۔ ''بگذشت وائے شبلی علامہ زماں'' کو مصرع تاریخ مانا گیا ہے، جب کہ اس کے ۲۰۲۵ عدد بنتے ہیں۔ مضمون نگار کو لفظ 'گزشت' زا سے لکھنا چاہیے تھا تب ۱۳۳۲ عدد پورے بیٹھتے ہیں۔

ص ۴۹: سید احمد مرتضی نظر کے مادّہ تاریخ ''شبلی بہ دار بقا رفت'' کو ۱۳۳۲ کے مطابق لکھا گیا ہے حالانکہ یہ ۱۳۳۷ کے برابر ہے۔ مضمون نگار اگر ''بدار'' ملا کر لکھتے تو عدد تاریخ ۱۳۳۲ کے مطابق ٹھیک نکلتے۔ ان کے ایک دوسرے مادّہ ''مولانا شبلی جنت نشین'' کے عدد ۱۳۳۲ لکھے ہیں جب کہ یہ ۱۳۳۳ ہوتے ہیں۔

ص ۵۰: پروفیسر سید نواب علی کے قطعہ کے آخری مصرع ''ابن رشد الہند رفتہ زور قلم'' میں زور قلم نہیں زد رقم ہونا چاہیے۔

امید ہے فاضل مضمون نگاران گزارشات پر دوبارہ غور فرمائیں گے۔

عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

رسید کتب موصولہ

آصف اعظمی، **اردو شاعری کا معاصر منظرنامہ**: آئیڈیل فاؤنڈیشن، ممبئی، صفحات: ۴۴۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۶۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۳۱۰۳۲۰۳۷۱

ڈاکٹر عابدہ حق صباء، **بادِ صبا**: پوسٹ وسئی روڈ ویسٹ، ضلع پالگھر، مہاراشٹر، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۷۵/روپے، موبائل نمبر: ۹۲۲۰۵۲۴۶۴۹

مولانا ابوالکلام آزاد، ترتیب و تالیف: حمیدہ بانو و مبشر احسن ندوی، **تفسیر سورۂ فاتحہ**: ایم آر پبلی کیشنز، میٹرو پول مارکیٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی، صفحات: ۳۸۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۰۷۸۴۵۴۹

مولانا عتیق احمد بستوی، **دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ (جلد اول، دوم، سوم)**: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، صفحات بالترتیب: ۴۸۸، ۷۰۴، ۵۶۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت بالترتیب: ۴۵۰، ۵۵۰، ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۷۷۶۰۸۳

محمد یٰسین قدوسی، **ڈاکٹر محمد الیاس قدوسی جائزہ حیات و خدمات**: محمد عامر قدوسی، آمنہ منزل، نیا بازار، کامٹی، ضلع ناگپور، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۳۷۰۱۶۹۵۷۱

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **شبلی نعمانی (مونوگراف)**: اردو اکیڈمی، سی-پی-او بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی، صفحات ۱۴۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت ۸۵/روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

محمد یٰسین قدوسی، **شہر دلکشا برہانپور**: قدوسی ہاؤس، تاج چوک، نیا بازار، کامٹی، ناگپور، صفحات: ۱۴۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: ۲۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۳۷۰۱۶۹۵۷۱

راشد ساز، **لایموت: ایک خودنوشت**: ملی پبلی کیشنز، ملی ٹائمنر بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی، صفحات: ۴۲۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۷۰۱۷۶۱۵۸۸۳

ڈاکٹر عطا عابدی، **لمحاتِ فکر (سماجی، تہذیبی افکار و تناظرات)**: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۳۵۸۲۵۱۱۱۷

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، **مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی دینی و علمی خدمات- کچھ اہم پہلو**: ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات ۱۷۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۰۵۸۲۸۱۴۹۴

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

JUNE 2024 Vol- 211(6) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعاتِ شبلی	〃	550/-
حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
تذکرۃ المحدثین دوم	〃	225/-
تذکرۃ المحدثین سوم	〃	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
تاریخ اسلام اول و دوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	560/-
تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	〃	500/-
تاریخ صقلیہ اول و دوم (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	800/-
تاریخ اندلس (چار جلدیں)	〃	1200/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-